www.urducouncil.nic.in

قیمت: -/10 ₹

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

فروری 2023

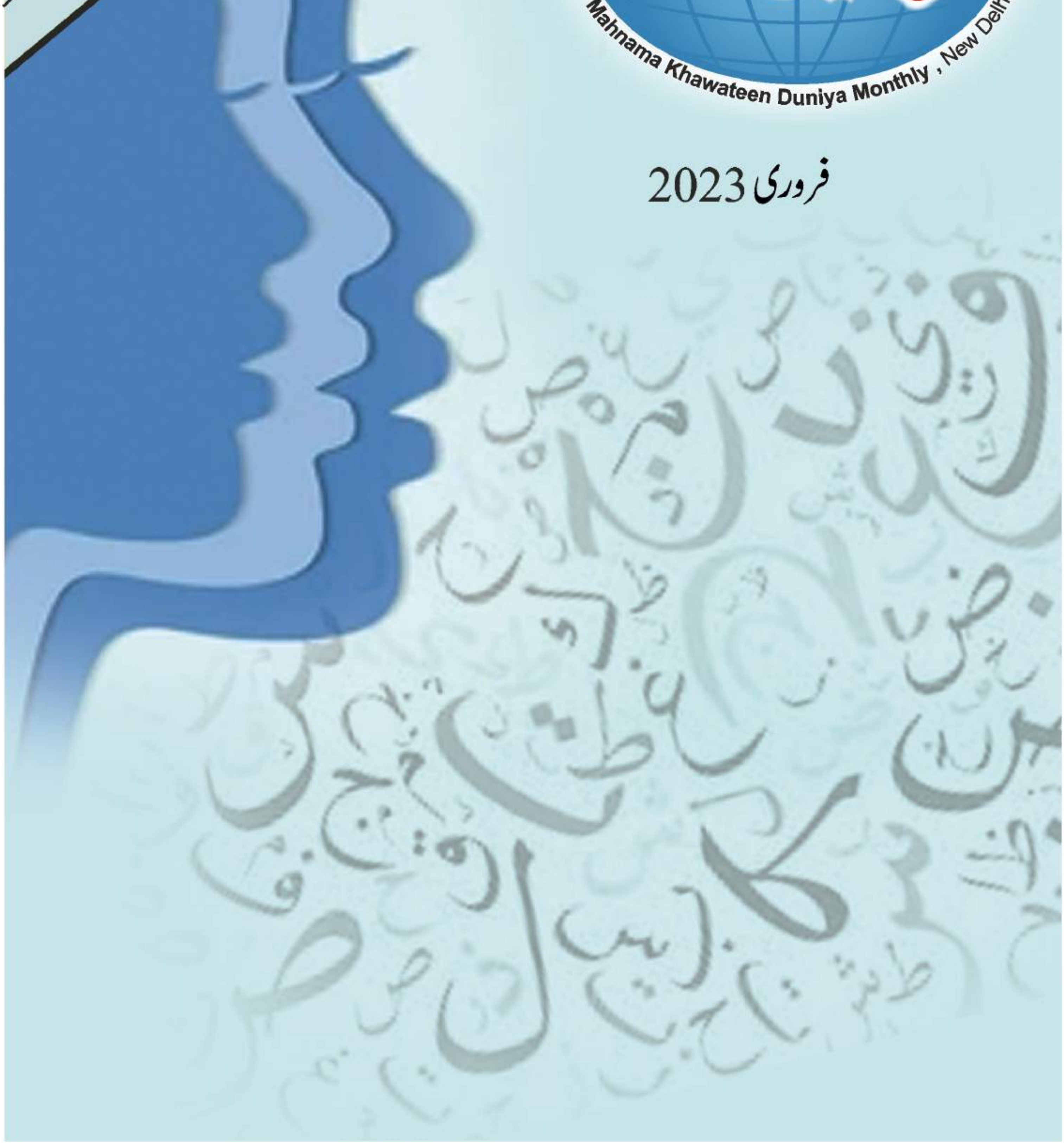

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس وٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی

میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب

بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

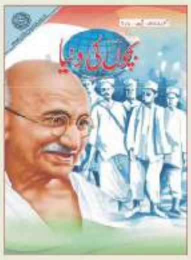

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 ، A/C: IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ

مشعل — مدیر — 4

شخصیت

شفیقہ فرحت کے طنز و مزاح کی فکری جہات — شازیہ اشرف — 5

نکہت سخن

شاعرات کے منتخب اشعار — 10

جہان نسواں

پروفیسر اشرف رفیع کی تنقید نگاری — ڈاکٹر نظیر احمد گنائی — 11

'خوبصورت بلا' کا نمائندہ کردار شمسہ — عبدالرحمٰن — 15

سیتاہرن میں کرداروں کی مماثلت — صائمہ — 19

کلاسیکی اردو شاعری میں رقیب کا کردار — مہر فاطمہ — 24

ادب اور صحافت پر ایک طائرانہ نظر — روحی جان — 28

اعتراف ہنر

نسائی ادب اور صاحبہ شہریار — منظور احمد گنائی — 31

شخص اور شاعر

ندا فاضلی کی شاعرانہ جہتیں — ڈاکٹر مسرت — 36

ندا فاضلی کے منفرد کلام کی عکاسی — نصرت جہاں — 40

حالی کی انفرادیت و عظمت — ڈاکٹر یاسمین فاطمہ — 45

حسن سخن

سیدہ نسرین نقاش، عائشہ صدیقہ جے، ہاجرہ خاتون — 48

افسانہ

کسک — پروفیسر نسرین بیگم علیگ — 50

مبارک ہو! — بدر فاطمہ قاضی — 53

خوش قسمت — صاحبہ فردوس — 56

صحت

ماحولیات و صحت — محمد اکرم — 59

قارئین کے خطوط

مراسلہ — 62

اردو آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 7 شمارہ: 2 فروری 2023

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

معاون مدیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی۔ 110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: **64** Total Pages

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL)

اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002

فون: 24415194 - 040

مشعل

زبان کوانسانی زندگی کا اہم جز تصور کیا جاتا ہے۔ زبان کے بغیر ہم اپنی بات کی ترسیل نہیں کر سکتے۔ مادری زبان میں ایک ایک لفظ میں اس ملک کی تہذیب، آداب معاشرت اور اس زبان کا تہذیبی رچاؤ نظر آتا ہے۔ زبان کے بغیر فرد کے وجود کا تصور کرنا محال ہے۔ کسی بھی انسان کا وجود زبان کے بغیر ادھورا اور نامکمل ہے۔ زبان سے ہی ہم اس شخص کی علمی و ادبی شناخت کا تعین کر سکتے ہیں۔ مادری زبان انسان کی شناخت کا ذریعہ ہوتی ہے۔ تعلیم انسانی ذوق کو بھی پروان چڑھاتی ہے۔ جب کوئی زبان زوال کا شکار ہوتی ہے تو اسی کے ساتھ اس ثقافت کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔

قوم کی نشو و نما میں بھی زبان اہم کردار ادا کرتی ہے۔ مادری زبان انسانوں میں نسل در نسل منتقل ہوتی رہتی ہے اور عوام کی رہنمائی میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ زبان انسانوں کی تشکیل میں اہم رول ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اس ملک کی تعمیر و تشکیل میں بھی معاون کردار ادا کرتی ہے۔ مادری زبان سے زندگی کا ہر شعبہ متاثر ہوتا ہے۔ ہر ایک شعبے میں مادری زبان کا اہم رول ہے۔ بچپن سے ہم جو زبان بولتے اور سنتے ہیں اس سے ہم دلی وابستگی رکھتے ہیں۔ مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنا طالب علم کے لیے بھی آسان ہوتا ہے۔ معلم کے لیے بھی اس کی اپنی مادری زبان میں تعلیم دینا آسان ہوتا ہے۔ تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ ایک معلم کے لیے زبان پر مکمل دسترس رکھنا بہت ضروری ہے۔

دنیا بھر میں اکیس فروری کو یوم مادری زبان کے طور پر منایا جاتا ہے۔ مقصد اس کا یہی ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے مادری زبانوں کا فروغ ہو سکے اور زبان کو تقویت حاصل ہو سکے۔ مادری زبان کے فروغ کے لیے بہت سے لائحہ عمل تیار کیے گئے۔ مادری زبان سے ہمارا ربط رہے اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے بچوں کی تعلیم اور اس کی مادری زبان میں ہی کریں۔ ان کے لیے فضا سازگار کریں۔ ان کو ایسا ماحول فراہم کریں کہ خود بہ خود وہ اپنی زبان کی طرف مائل ہوں۔ مادری زبان کے تئیں ان کی دلچسپی برقرار رہے اس کے لیے ضروری ہے کہ ان کی تربیت سازی اس طرز پر کی جائے کہ ان میں خود بہ خود اپنی زبان کے تئیں لگاؤ پیدا ہو۔ مادری زبانوں کے فروغ کے لیے بچوں میں دلچسپی پیدا کرنے والے ذرائع کی طرف توجہ دی جانی چاہیے۔ جدید ٹیکنالوجی سے مادری زبانوں کو اگر جوڑ دیا جائے تو نئی نسل اس میں بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کر سکتی ہے۔ جدید دور میں اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنا انسان کا پہلا اور بنیادی حق ہے۔ مادری زبان میں دی جانے والی تعلیم بچوں میں مثبت سوچ کو جنم دیتی ہے۔ مادری زبان کے فروغ کے لیے عصری تقاضوں سے بھی زبان کو ہم آہنگ کیا جاسکتا ہے۔

اردو زبان کا مستقبل بہت تابناک ہے۔ ہم سب مل کر اس کی ترقی کے لیے کوششیں کریں تو اس کے بہت بہتر نتائج آئیں گے۔

آپ کا

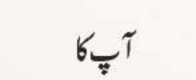

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

شخصیت

شازیہ اشرف

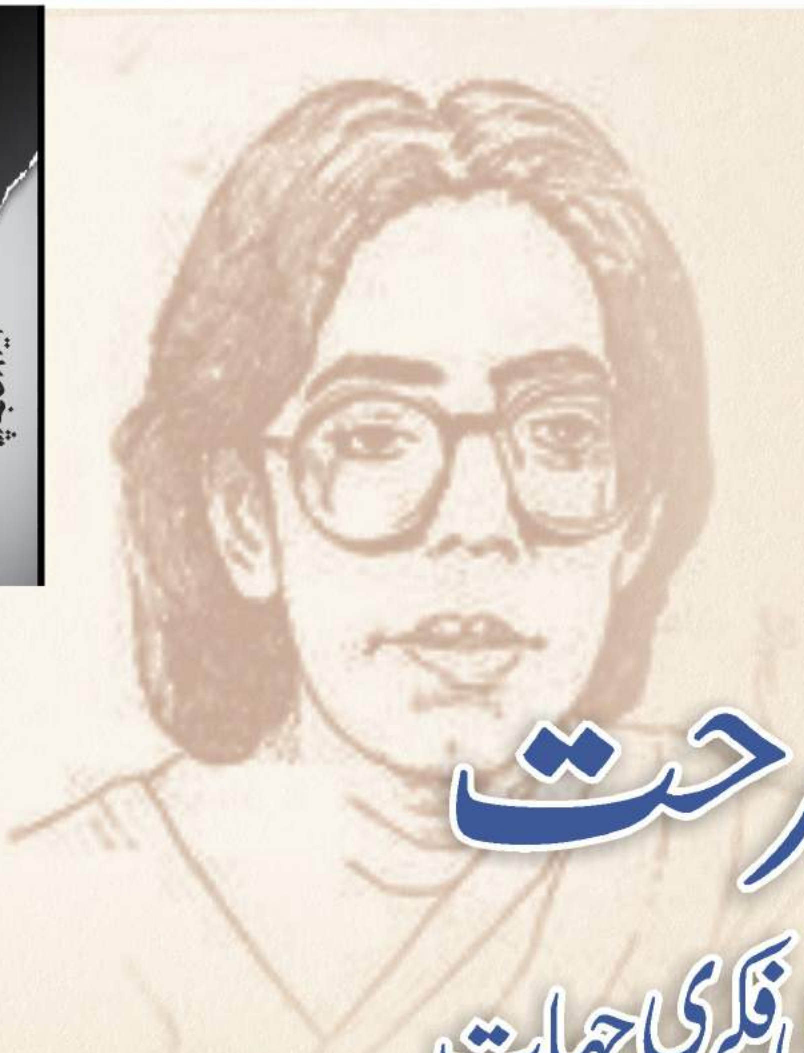

شفیقہ فرحت

کے طنز و مزاح کی فکری جہات

اردو ادب کی تاریخ میں جن قلم کاروں کی فکری صلاحیت اور فنی اختصاص کی وجہ سے طنز و مزاح کا جہاں آباد ہے اُن میں مشتاق احمد یوسفی، رشید احمد صدیقی، کنہیالال کپور، پطرس بخاری، مجتبیٰ حسین، کرنل محمد خان، فکر تونسوی، یوسف ناظم کے ساتھ ساتھ شفیقہ فرحت بھی ممتاز مقام رکھتی ہیں۔

شفیقہ فرحت کی پیدائش 26 اگست 1931 کو ناگپور میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام محمد رستم خان تھا جو انگریز سرکار کے پولیس محکمے میں سی۔ آئی۔ڈی تھے۔ بعد میں بُرہان پور کے کوتوال ہو گئے۔ شفیقہ فرحت کی تعلیم ابتدا سے پانچویں تک ناگپور کے کانونٹ سینٹ جوزف اسکول میں ہوئی، جس کا شمار اس وقت کے سب سے معیاری اسکولوں میں ہوتا تھا۔ ان کا اپنا بیان ہے کہ پانچویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے فر فر انگلش بولنے لگی تھیں۔ والد کے تبادلے کے سلسلے میں شفیقہ کو کئی اسکول بدلنے پڑے۔

1947 میں میٹرک کا امتحان پاس کیا پھر ناگپور کے سی۔سی۔ڈبلیو کالج سے 1951 میں بی۔اے کیا۔ بی۔اے کے بعد پولیٹکل سائنس میں ایم۔اے کر کے عملی سیاست میں حصہ لینا چاہتی تھیں لیکن والد کی مالی حالت بہتر نہ ہونے کی وجہ سے 1954 میں ناگپور سے صحافت میں ڈپلوما کیا۔ شفیقہ فرحت نے بی۔اے۔ کے زمانے سے لکھنا شروع کیا تھا۔ ان کی پہلی تخلیق 1951 میں کالج میگزین میں ڈرامہ نما انشائیہ کی صورت میں شائع ہوئی۔ جرنلزم میں ڈپلوما مکمل کرنے کے بعد ناگپور سے نکلنے والے رسالے ''چاند'' کی معاون مدیر رہیں ۔عورتوں اور بچوں کے لیے مشترکہ پرچہ ''کرنیں'' جاری کیا، کرنیں کو بہت پسند کیا گیا۔ یہ ہر اعتبار سے معیاری رسالہ تھا لیکن مالی پریشانی کی وجہ سے مجبوراً اسے بند کرنا پڑا اور شفیقہ

فرحت طنز و مزاح کی طرف راغب ہوئیں۔ اس حوالے سے ان کا ذاتی بیان ہے:

''کرنوں'' کا انجام بھی ''چاند'' سے کچھ مختلف نہ رہا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ چاند' غروب ہوا تو ہمیں ایڈیٹر بنایا گیا اور'' کرنیں'' مٹیں تو ہم مرثیہ لکھنے کے بجائے مزاح نگاری کرنے لگے۔''

(شفیقہ فرحت، گول مال، نئی آواز جامعہ نگر نئی دہلی 1988، ص،46)

''کرنیں'' کے بند ہونے کے بعد فرحت نے ناگپور یونیورسٹی سے 1957 میں اردو میں ایم۔اے کیا اور پھر بھوپال میں پبلک سروس کمیشن کے تحت ان کا سلیکشن ہو گیا اور مہارانی لکشمی بائی گرلز کالج میں اردو کی لیکچرر مقرر ہو گئیں۔ 1957 میں فرحت بھوپال گئیں اور زندگی کے قیمتی پچاس برس وہیں گزارے۔ دوران ملازمت انہوں نے ناگپور یونی ورسٹی سے 1962 میں فارسی میں ایم۔اے کیا۔ اس کے بعد حمیدیہ کالج بھوپال میں اردو کی لیکچرر اور صدر شعبۂ اردو ہوئیں۔ بھوپال میں قیام اور دوران ملازمت انہوں نے ''نذیر اکبرآبادی ایک مطالعہ'' (ہندی میں) کے عنوان سے تحقیقی مقالہ تحریر کیا، جس پر جیواجی یونی ورسٹی گوالیار نے انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی۔ 1991 میں ملازمت سے سبکدوش ہوئیں۔ اس کے بعد وہ 'انجمن ترقی اردو مدھیہ پردیش کی جنرل سکریٹری، انجمن ترقی پسند مصنفین مدھیہ پردیش کی نائب صدر اور مدھیہ پردیش کی مجلس عام و مجلس عاملہ کی رکن رہیں۔ بھوپال میں خواتین کی ادبی اور سماجی انجمن ''دھنک'' کی صدر رہیں۔ روڈ رائٹرس اسوسی ایشن سے بھی وابستہ تھیں۔ اس کے علاوہ آل انڈیا ویمنس کونسل کی نائب صدر اور تاعمر ممبر رہیں۔

ادبی دنیا میں قدم رکھتے ہی شفیقہ فرحت نے اپنی راہ آپ اختیار کی۔ اُس وقت ادبی منظرنامے پر اپنا نام کمانے والی خواتین تخلیق کاروں کے برعکس موصوف کی معنویت ان معنوں میں ہے کہ آپ نے اپنے موضوعات کو ایک انوکھے اسلوب میں پیش کرنے کی طرح (طنز و مزاحیہ اسلوب) اختیار کی۔ انہوں نے مزاحیہ مضامین کے علاوہ ڈرامے اور انشائیے بھی لکھے ہیں لیکن ادبی حلقوں میں ان کی شہرت و مقبولیت کی اصل وجہ ان کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین ہی قرار دیے جاسکتے ہیں۔ انہوں نے اپنی طنز و مزاح نگاری سے اردو مزاحیہ ادب کو مالا مال کر دیا۔ 'لو آج ہم بھی'، 'گول مال'، 'رانگ نمبر'، 'ٹیڑھا قلم' اور 'نیم چڑھے' کے نام سے ان کے اب تک پانچ طنزیہ و مزاحیہ مضامین کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اس فن پر وہ مکمل گرفت رکھتی تھیں جس کا بین ثبوت اختر سعید خان کا درج ذیل مختصر اقتباس ہے:

''شفیقہ فرحت کے موضوعات بہت انوکھے اور اچھوتے ہوتے ہیں۔ ان کی فکر اور ذہن کی بے باکی، اسلوب کا تیکھا پن طنزیہ اور مزاحیہ ادب میں ان کی شناخت کو نمایاں کرتا ہے۔''

(شفیقہ فرحت، ٹیڑھا قلم، آہ پرنٹرس سلطانیہ روڈ بھوپال 2003، ص،4)

اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت کا جائزہ لیتے ہوئے یہ حقیقت ازبر ہو جاتی ہے کہ شفیقہ فرحت سے قبل بھی بعض خواتین تخلیق کاروں نے اس میدان میں قدم جمانے کی بلاشبہ کوششیں کی ہیں لیکن فکری و فنی ہر دو اعتبار سے اس صنفِ ادب کو برتنے والی فن کار شفیقہ فرحت ہی ہیں۔ ان کی تحریروں میں طنز و مزاح کا بہترین امتزاج ملتا ہے۔ اپنے پہلے مجموعہ 'لو آج ہم بھی'' کے ذریعے ہی انھوں نے اس میدان میں قدم رکھا۔ یہ مجموعہ مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی کے زیر اثر 1981 میں شائع ہوا۔ اس میں کل پندرہ مضامین شامل ہیں۔ زبان کی سلاست و روانگی کے علاوہ الفاظ کے الٹ پھیر سے اور اشعار میں حرف کی تبدیلی سے ایسا مزاح پیدا کرتی ہیں کہ قاری ہنسنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسائل پر بھی ان کی اچھی گرفت ہے۔ انہوں نے جن مسائل کو اپنے طنز کا موضوع بنایا وہ ہماری زندگی سے کافی قریب نظر آتے ہیں۔ ''میری روم میٹ'' اس کی عمدہ مثال ہے۔ یہ بیانیہ طرز کا مزاحیہ مضمون ہے۔ جس میں روم میٹ کی زبانی کہانی بیان کی گئی ہے۔ روم میٹ اپنی ساتھی سے اس قدر پریشان ہے کہ شب معراج میں جب لوگ جہنم سے رہائی کے لیے گناہوں سے توبہ کرتے ہیں وہ اپنی روم میٹ سے نجات کی دعا کرتی ہے۔ روم میٹ ایک ایسی افسانہ نگار ہے جس کا آج تک کوئی افسانہ شائع نہیں ہوا بلکہ ہمیشہ رسالے سے واپس کر دیا جاتا ہے۔ افسانہ نگار صاحبہ ہیں کہ ان کو ہمہ وقت نئے نئے افسانوں کے پلاٹ وحی کی صورت میں نازل ہوتے ہیں:

''روم میٹ ہونے کے علاوہ وہ افسانہ نگار بھی ہیں۔! ان کی رگ رگ میں ایک عظیم آرٹسٹ کی روح تڑپ رہی ہے۔۔۔ ان کی ساری عادتیں اٹھنا، بیٹھنا، سونا، جاگنا، کھانا، پینا، غرض ہر چیز انتہائی آرٹسٹک قسم کی ہے۔! یہ اور بات ہے کہ ان کے دس میں سے پانچ افسانے شکریے کے ساتھ واپس آجاتے ہیں اور باقی پانچ وہ خود نہیں بھیجتی ہے۔''

(شفیقہ فرحت، لو آج ہم بھی، مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی۔ بھوپال 1981، ص،10)

فرحت نے اپنے مزاحیہ مضامین میں بہت سارے موضوعات کو جگہ دی ہے۔ انہوں نے زندگی کے مختلف پہلوؤں کو طنزیہ اور مزاحیہ انداز

میں پیش کیا ہے۔طنز ومزاح صرف ہنسنے کا نام نہیں بلکہ سماج کے ہر مسئلے کو بڑی گہرائی اور گیرائی سے پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔فرحت کی تحریروں پر اگر نگاہ ڈالی جائے تو احساس ہوتا ہے کہ صرف ہنسنا ہنسانا ہی ان کا مقصد نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے اصلاح کا مقصد بھی پوشیدہ نظر آتا ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں سماج کے سلگتے مسائل پر آواز بلند کرتی ہیں۔ان کی تحریروں میں صرف مزاح ہی نہیں بلکہ طنز کے نشتر بھی موجود ہیں جس سے وہ سماجی تہذیبی مسائل کا حل چاہتی ہیں۔موجودہ دور میں جس طرح انسان اپنی اصل سے کٹ کر ایک خودغرضانہ روپ اختیار کر گیا ہے اس نے کم و بیش زندگی کے ہر ایک شعبے پر اپنے تباہ کن اثرات مرتب کیے ہیں۔مادی ترقی کے اس شور شرابے اور ریل پیل میں گم انسان اشیائے خوردونوش کو بناوٹی بنانے سے گریز نہیں کرتا ہے۔ان معمولی مگر سنگین مسائل کے حوالے سے بھی موصوفہ نے اپنے کئی ایک مضامین تحریر کیے ہیں جن کے مطالعے کے بعد ان کی وسیع النظری کا بخوبی احساس ہوتا ہے۔اس سلسلے میں یہ مختصر اقتباس بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے:

''خیر انھوں نے ہم سے پوچھا ''چرن امرت لیں گی۔''ہم نے کہا۔ضرور۔مگر صرف پانی والا۔کہ دودھ ہم نے کبھی پیا ہی نہیں۔چھٹی کا دودھ بھی نہیں۔اور پھر دودھ کون سا خالص ہوتا ہے۔تو آپ ہمیں پانی ہی دیجیے۔اس water crisis. کے دور میں پانی ہی امرت ہے۔

(شفیقہ فرحت، ٹیڑھا قلم، آہ پرنٹرس سلطانیہ روڈ بھوپال 2003، ص، 91)

فرحت نے جہاں رشوت خوری اور باقی سماجی برائیوں کو اپنے مضامین میں طنز کا نشانہ بنایا وہی انہوں نے دور حاضر میں اپنی جڑیں مضبوط کرنے والے ان سلگتے مسائل پر بھی خامہ فرسائی کی ہے جو غیر محسوس طور پر انسانیت کو اندر ہی اندر برباد کیے ہوئے ہے۔ان میں سماجی وطبقاتی تفریق کی ذہنیت ہر صورت میں پیش پیش ہے۔موصوفہ کے کئی مضامین میں (Social status) امیری، غریبی کا ذکر دیکھنے کو ملتا ہے۔انہوں نے اپنے مضامین میں اکثر ان مسائل کو ابھارا ہے۔ان کا ایک مضمون ''حضرت آلو'' جس میں وہ آلو کی خوبیوں کو گنواتے ہوئے سب سے بڑی خوبی یہ بتاتی ہیں کہ آلو خدا کی ایسی نعمت ہے جس تک امیر وغریب اور گدا وفقیر سب کی رسائی ممکن ہے۔امید کے تمام دروازے بند ہونے کے بعد لوگوں کو بے چارہ آلو ہی یاد آتا ہے۔دنیا کی ناپیداری کے بارے میں ایک مضمون ''کفن بھی ہو ریشم کا'' میں فرحت نے سماج کے ان لوگوں پر طنز کیا ہے جو اپنی ظاہری جاہ وحشمت کے برابر لوگوں میں ہی رشتے اور دوستی بناتے ہیں۔امیری اور قیمتی چیزوں کے چکر میں یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کو ایک دن مرنا ہے اور وہاں چاہے امیر ہو یا غریب سب کا کفن اور دفن ایک جیسا ہوگا۔یہاں ریشم کے کپڑے پہننے والے کو بھی وہی کفن ملے گا جو ایک غریب کو ملے گا۔انھوں نے یہاں طنز ومزاح میں منطقی سوچ کا رویہ اپنایا ہے۔فرحت کا خیال ہے کہ اس دنیا میں سب ننگے آتے ہیں لیکن یہ انسانی سماج ہی ہے جو اس مخلوق کو کئی خانوں میں بانٹ کر ان میں تفریق کے مادے کو جنم دیتا ہے۔یہ امتیازات سب انسان کی اپنی کارستانی ہے۔اپنے ایک مضمون میں انہوں نے منطقی سوچ کو طنزیہ انداز میں اس طرح برتا ہے:

''دیکھیے ذرا کشادہ جگہ منتخب کیجیے گا۔۔۔''

جی۔وہ لوگ چونکے۔''

''ہاں صاحب مرحوم نے کتنا بڑا گھر بنوایا۔۔کمرے حتیٰ کہ باورچی خانہ بھی دیکھیے کتنا لمبا چوڑا ہے۔آپ کی قبر بھی بڑی ہونی چاہیے۔میرا مطلب ہے کہ آرام سے لیٹیں۔کوئی تکلیف نہ ہو''

اہل شرع کو آپ کے اس فرمان سے جو شاک (shock) پہنچنا تھا وہ تو پہنچا ہی۔انہوں نے ذرا جھنجلا کر جواب دیا

''جناب قبر ہی ایک ایسی جگہ ہے جو قد سے زیادہ نہیں ہوتی ۔ کیا بادشاہ کیا فقیر۔مرحوم کے لیے دوگز کی کافی ہوگی۔''

کیا کہہ رہے ہیں آپ صرف۔صرف دوگز۔۔۔۔۔؟ تین تو کر ہی لیجیے ''

(شفیقہ فرحت۔ٹیڑھا قلم، آہ پرنٹرس سلطانیہ روڈ بھوپال 2003، ص 82)

اقبال مجید شفیقہ فرحت کے طنز ومزاح کے بارے میں رقم طراز ہیں:

'' طنز کی تلوار سے ''آلو'' کے ساتھ ساتھ سماج کی ایسی پرتیں اُڑاتی ہیں کہ داد نہیں دی جاسکتی۔''

(شفیقہ فرحت، ٹیڑھا قلم، آہ پرنٹرس سلطانیہ روڈ بھوپال 2003، ص، 4)

ادب اور معاشرے کے گہرے اور دوطرفہ تعلق کے پیش نظر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ادب کا مطالعہ اس کے سیاسی، معاشی اور تہذیبی پس منظر میں کیا جائے۔اردو نثر وشاعری میں طنز ومزاح بھی مخصوص سیاسی محرکات وعوامل سے متاثر ہوتا رہا ہے۔طنز ومزاح سیاسی برائیوں، ظلم وجبر، استحصال اور دیگر عادات بد کی تنقیص اور مزاحمت کے لیے موثر ہتھیار ہے۔مزاح نگار معاشرے کی ناپسندیدہ اقدار، اخلاق اور معیار کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے، وہ عقل عامہ (common sense) کو فروغ دیتا ہے۔چناں چہ ہر دور کے طنز ومزاح نگاروں کے یہاں اپنے

دور کے حالات پر اظہار خیال ملتا ہے۔فرحت نے بھی اپنے زمانے اور سماج کے ان ہی موضوعات کو طنز و مزاح میں برتا ہے۔

فرحت کی تحریروں میں نسائی فکر بھی جھلک نظر آتی ہے۔ایک عورت ہونے کے ناطے انہوں نے عورتوں کے لطیف جذبات کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ اپنے ایک مضمون ''بد اور بدنام'' میں شاپنگ کے بارے میں لکھتی ہیں۔شاپنگ کا نام سنتے ہی ہر انسان کے دماغ میں عورت کا نام آ ہی جاتا ہے۔ایک عورت کے پاس چاہیے کتنا بھی سامان اور ضروریات زندگی کیوں نہ ہو شاپنگ کا نام سنتے ہی سب غائب ہو جاتا ہے اور وہ پھر سے شاپنگ کرنے نکلتی ہے اور گویا یہ کام تو دنیا میں عورت سے ہی منسوب ہے:

'' ایک صاحبہ نے ہم سے پیور سلک کی ساریاں خریدوانے کی فرمائش کی، دس بارہ دکانوں کی تلاشی لینے کے بعد انہوں نے تو صرف ایک ساری خریدی ہمیں تو پانچ پسند آ گئیں۔خیر پسند کی بات بھی چھوڑیں ان دکان داروں کی بھی دل جوئی کرنی تھی۔ جہاں کا سارا اسٹاک لٹوانے کے باوجود انہوں نے ایک رومال تک نہیں خریدا، ان کا کیا تھا ہماری تو Repuatation کا سوال تھا۔''

(شفیقہ فرحت، گول مال، نئی آواز جامعہ نگر نئی دہلی 1988، ص، 37)

تہذیب اور ثقافت سے ہر انسان کے شعور اور تحت الشعور کی تشکیل ہوتی ہے۔ ہر انسان کی جڑ کسی نہ کسی تہذیب اور ثقافت سے جڑی ہوتی ہے اور انسان کی ذمے داری ہے کہ اپنی تہذیب اور ثقافت کی حفاظت کریں لیکن موجودہ دور کا انسان جتنا ترقی کرتا گیا اتنا ہی وہ اپنی تہذیب وثقافت سے دور ہوتا گیا۔آج کل انسان دن رات محنت کر کے ہر چیز میسر ہونے کے بعد بھی پریشان ہے۔اگر دیکھا جائے کہ جو ہمارے پرانے لوگ خود محنت کر کے کما کر کئی طرح کے اناج سبزیاں اگاتے تھے لیکن آج کے انسان کے پاس جس چیز کی کمی ہے وہ ہے وقت۔فرحت اپنے ایک مضمون ''ہدایت نامہ جدید'' میں اناج یعنی ''گیہوں'' کے بارے میں کہتی ہیں کہ ہمارے پاس سے کئی ایسی نعمتیں ہیں جو روئے زمین سے بالکل غائب ہو جائیں گی اور ان کا ذکر صرف کتابوں میں ملے گا اور چند دانے عجائب گھروں محفوظ کر لیے جائیں گے:

'' جنہیں تم اپنے نواسوں، پوتوں کو دکھا کر کے بڑے فخر سے کہو گے
''دیکھو ایک زمانے میں ہم اسے کھایا کرتے تھے'' اور وہ شوخ چنچل دانے جو نظروں میں سمانے کے بجائے نظروں سے بچ کر آدی واسی، نرت کرتے ہوئے ادھر ادھر بکھر جائیں گے وہ صدیوں بعد ہڑپا اور مہنجو داڑو کی سی کھدائی میں دستیاب ہوں گے اور تحقیق اور تہذیب کے نئے دروازے اور علم کی نئی کھڑکیاں کھولیں گے۔''

(گول مول، ہدایت نامہ جدید، شفیقہ فرحت ص، 13)

شفیقہ فرحت کا طنز و مزاح چٹکلا پن تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ سماج میں جراحی کا کام انجام دیتا ہے۔جس طرح جراحی گندگی کو جسم سے غیر ضروری مادہ کو نکال کر پاک کیا جاتا ہے اسی طرح فرحت کا طنز و مزاح بھی سماج میں پھیلی گندگی کو صاف کرنے کی سعی کرتا ہے۔رشوت خوری، سماج کی ایک ایسی بیماری ہے جو سنتری سے منتری تک سب میں برابر دیکھی جا سکتی ہے۔ان کے یہاں پولیس پر طنز کے نشتر مضمون ''تلاشی'' کی صورت میں کچھ اس طرح بیان ہوئے ہیں۔

''اپنی راہ تو انھوں نے کھوٹی نہیں کی۔لیکن اب ہر راہ کھوٹی اور چھوٹی ہو رہی ہے۔اور کچھ نہیں تو تلاشی ہی سہی گھر گھر، گلی گلی۔راستے چلتے مزدوروں کی۔ پھیری والوں کی، ردی سامان والے کی، چائے کی گمٹیوں کی، موچیوں کی ڈبوں کی بوٹ پالش کا اسٹینڈ ضبط، سبزی والے کا باٹ ضبط، تربوزے والے کی چھری ضبط، ردی والے کی شیشے کی خالی بوتلیں ضبط کہ یہ سارے کے سارے وہ ہتھیار ہیں جنہیں دنگا فساد میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔جن سے سر پھوڑے اور گردنیں کاٹی جا سکتی ہیں اور کنکر پتھر کی قسمت تو دیکھیے وہ بھی پلٹ گئی۔انھیں بھی خونی ہتھیاروں کا درجہ مل گیا۔''

(شفیقہ فرحت، ٹیڑھا قلم، آہ پرنٹرس سلطانیہ روڈ بھوپال 2003، ص، 17)

منطقی فکر و سوچ ان کے طنز و مزاح کی ایسی خصوصیت ہے جو قلیل تعداد میں عورت طنز و مزاح نگاروں میں پائی جاتی ہے۔عقیدہ پرستی کے خلاف جنگ شفیقہ فرحت کے یہاں طنز و مزاح کی صورت میں نمایاں دکھائی دیتی ہے۔''ہم نے منت اتاری'' مضمون میں انہوں نے اپنی بہن کی عقیدہ پرستی کی عکاسی خوب صورت انداز میں یوں کی ہے:

''غرض دن میں دس بارہ منتوں کا (average) تو ہو ہی جاتا تھا۔ یہ منتیں دس پانچ پیسوں یا چار چھ نفلوں تک محدود رہتیں۔ پھر بھی بے چاری کی آدھی پاکٹ منی اور کھیل کود کا آدھا وقت منتوں کے ٹیکس کے طور ختم ہو جاتا۔۔

عقل آنے پر بھی اس کی یہ عادت گئی نہیں ۔۔۔۔۔۔سر ڈھا
نک کے منت مانگی اور مزار کی جالی پر مجاور صاحب کا دیا ہوا
لمبا سا دھاگا باندھ دیا۔''

(شفیقہ فرحت، ٹیڑھا قلم، آہ پرنٹرس سلطانیہ روڈ بھوپال 2003، ص، 28-29)

شفیقہ فرحت کی سیاسی فکر بھی ان کے طنز و مزاح کا ایک اہم موضوع رہا ہے۔ان کے یہاں سیاست بھی طنز و مزاح کا نشانہ بنا۔فرحت کی پوری انسانی زندگی پر طائرانہ نگاہ تھی۔سیاست کے ہر رنگ ان کے مضامین میں دکھائی دیتے ہیں مگر کبھی کبھی ان کا طنزیہ انداز احتجاج اور مزاحمت تک پہنچ جاتی ہے۔ان کے کئی طنز و مزاحیہ مضامین میں احتجاج اور مزاحمت درخشاں ستاروں کی طرح چمکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔فرحت چھوٹی چھوٹی باتوں سے طنزیہ انداز میں بڑی بڑی باتیں اور معاشرے کا ضمیر جگانے کی کوشش کرتی ہیں کیوں کہ مادیت کے چکر میں انسان بے حس ہو کر انسانیت سے دور ہوتا گیا جس کو انھوں نے کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

'' پہلے لال قلعہ اہم اور قطب مینار بلند سمجھا جاتا تھا۔مگر اب
سنگ خشت اینٹ پتھر کا دور نہیں رہا اب تو گوشت پوست
کے انسان پتھر سے بھی سخت اور بے حس بن چکے ہیں تو انھیں
کو دیکھ لیں۔کیسا لال قلعہ اور کہاں کا قطب مینار۔''

(شفیقہ فرحت، ٹیڑھا قلم، آہ پرنٹرس سلطانیہ روڈ بھوپال 2003، ص، 43)

ان کے یہاں سرمایہ دارانہ نظام کی اساس فکر کے تعلق سے بھی مزاحیہ انداز میں بڑی باتیں کہی گئی ہیں۔پوری دنیا میں بڑے پیمانے پر رواں دواں ماحولیاتی تبدیلی نے انسانیت کو شش و پنج میں مبتلا کر رکھا ہے۔اس ماحولیاتی تبدیلی نے دنیا کی معاشی و اقتصادی اور انسانی فلاح و بہبودی کو جس خطرے میں مبتلا کیا ہے وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ موجودہ دور کے بیشتر ادبا نے اس خطرے کے اسباب و علل کو اپنے اپنے منفرد اسلوب میں ادبی روپ عطا کیا ہے۔موصوفہ کے یہاں بھی اس فکری پہلو کے حوالے سے مواد دستیاب ہے۔ان کے مضامین کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس قدر گہرائی سے ان مسائل کا مشاہدہ کرتی ہیں۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں نہ صرف ان خطرات سے لوگوں کو آگاہ کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ ان قوتوں پر کھل کر طنز کے تیر برسائے ہیں جو ان سب صورت حال کی ذمے دار ہیں۔درج ذیل اقتباس نمونے کے طور پر پیش کرنا ناگزیر معلوم ہوتا ہے:

'' اور جنگل تیزی سے کاٹے جانے کے باوجود اب بھی
درختوں سے بھرے ہیں ۔اگر اناج ناپید ہے اور سبزی
ترکاریاں عنقا ہوئی تو اے مومنوں! تم بخوبی گھاس کھا سکتے ہو
۔درختوں کی پتیوں اور چھالوں سے ایک سے ایک عمدہ سالن
تیار کر سکتے ہو۔شاخوں کو پیس کے آٹا بنا سکتے ہو۔''[14]

(شفیقہ فرحت، گول مال، نئی آواز جامعہ نگر نئی دہلی 1988، ص، 16)

شفیقہ کے یہاں گوناگوں تانیثی فکر بھی دھیمی سی خوشبو کے ساتھ کم و بیش ماحول کو معطر کرنے میں پیش پیش دکھائی دیتی ہے۔ان کے یہاں صدیوں سے عورت ذات پر بٹھایا ہوا پہرہ ،لڑکیوں کے باہر جانے پر قدغن، معاشرے میں صدیوں سے چلی آرہی ریت کے خلاف زبردست احتجاج دیکھنے کو ملتا ہے۔گھر میں رہ رہے لوگ کسی پولیس یا ملٹری سے کم نہیں ہوتے تھے۔اس قدغن لگانے کے خلاف احتجاج اور مزاحمت کی مضبوط آواز ان کی تحریر میں سنائی دیتی ہیں۔

'' 1955 میں جرنلزم میں یہ ڈپلوما بھی کیا۔اب پھر وہی سوال
سامنے تھا۔کہ اس ڈپلوما کا ہم اچار ڈالیں کہ مرّبا بنائیں۔گھر
کے پولیس راج کو جو کسی صورت سے ملٹری رول سے کم نہیں تھا
جس کی وجہ سے کسی اخبار میں کام کرنے سوال ہی نہ تھا۔''

(شفیقہ فرحت، گول مال، نئی آواز جامعہ نگر نئی دہلی 1988، ص، 45)

شفیقہ فرحت فطرتِ انسانی کی نباض ہے۔ان کا مشاہدہ اس قدر وسیع ہے کہ ان کی تحریروں میں انسان کی نفسی کیفیات اپنے خوب صورت اسلوب میں نظر آتی ہیں۔معمولی باتوں میں ہزاروں نئے پہلو تخلیق کرنا کچھ انہی کا حصہ ہے۔شفیقہ فرحت اپنے فن کی سیرابی کے لیے ہر اس عمل کو کام میں لاتی ہیں۔جس سے انسان کی وارفتگی ہوتی ہے۔اختر سعید خاں شفیقہ فرحت کے موضوعات اور فکری جہات کے بارے یوں رقم طراز ہیں:

'' شفیقہ فرحت کے موضوعات بہت انوکھے اور اچھوتے
ہوتے ہیں ان کی فکر اور ذہن کی بے باکی ، اسلوب کا
تیکھا پن طنزیہ اور مزاحیہ ادب میں ان کی شناخت کو نمایاں
کرتا ہے۔''

(شفیقہ فرحت، ٹیڑھا قلم، آہ پرنٹرس سلطانیہ روڈ بھوپال 2003ء، ص، 4)

□□□

Shazia Ashraf
University of Kashmir
Professor Colony, Naseem Bagh
Hazratbal
Srinagar-190006 (Jammu and Kashmir)

شاعرات کے منتخب اشعار

شوق کہتا ہے کہ چلیے کوئے جاناں کی طرف
چاہیے وارفتگی کی پاسداری ان دنوں

کیا تقاضا کیجیے ان سے نگاہ لطف کا
بے نیازی ہے وہاں یاں سوگواری ان دنوں

حیا لکھنوی

میں کتابوں میں رکھوں یہ فطرت نہیں
پھول سوکھے ہوئے بے زباں تتلیاں

یہ صحیفہ نہیں میری روداد ہے
اس کا عنوان ہے تلخیاں تلخیاں

لتا حیا

نقش محرومی تقدیر کو تدبیر میں رکھ
سعی امکاں سے گزر شوق کو تعمیر میں رکھ

اپنے احساس رفاقت کا بنا مجھ کو گواہ
اور پھر میری گواہی مری تفسیر میں رکھ

نسیم سید

اس کے ہونے کی خبر شہر میں دل نے پائی
کوئی ساعت کی بھی فرصت نہیں ملنے پائی

ہاتھ پہ رکھوں تیرے نقش ابھر آتے ہیں
کیا صفت دیکھ تو اس شہر کی گل نے پائی

شاہدہ شاہ

خوابوں کی دنیا پھر سے دکھلا دو اماں
سونے جاگنے والی گڑیا لا دو اماں

میں دنیا کی چالاکی کو جان نا پاؤں
مجھ کو میرا بھولا پن لوٹا دو اماں

اسنیٰ بدر

جھرنوں کے درمیاں سے گزرنے لگی ہے شام
بھیگی ہوئی فضا سے نکھرنے لگی ہے شام

سونے نہ دے گی چین سے پھر رات بھر مجھے
آنکھوں میں دھیرے دھیرے اترنے لگی ہے شام

انیتا سونی

فیصلے کی اس گھڑی کا التوا اچھا لگا
ایک رشتہ ٹوٹنے سے بچ گیا اچھا لگا

میں نے غم کی دھن بھی چھیڑی اور خوشی کا راگ بھی
تم بتاؤ گیت میرا کون سا اچھا لگا

پروین کیف

سرد رشتوں کی برف پگھلی ہے
دھوپ مدت کے بعد نکلی ہے

پھوٹ پانی میں پڑ گئی ہے کیا
لہر دریا بنانے نکلی ہے

پوجا بھاٹیا

(بحوالہ ریختہ ویب سائٹ)

پروفیسر اشرف رفیع کی تنقید نگاری

ڈاکٹر نظیر احمد گنائی

مایہ ناز نقاد، ادیبہ، محقق، شاعرہ اور اعلیٰ پایہ کی مدرس اشرف رفیع کا جنم تلنگانہ میں ہوا۔ 14/ اگست 1940 کو ان کی ولادت سرزمین حیدرآباد میں ہوئی۔ ان کے والد محمد رفیع الدین صدیقی اردو اور فارسی کے مشہور شاعر تھے۔ اشرف رفیع کے شوہر ڈاکٹر مصطفیٰ علی خان فاطمی جامعہ عثمانیہ میں ریفرنس لائبریرین (Refrences Librarian) رہے۔ وہ خود بھی ایک اچھے اسکالر گزرے ہیں۔ اشرف رفیع نے 1965 میں اردو میں ایم۔ اے پاس کیا۔ پروفیسر مسعود حسین خان کی رہبری میں مقالہ ''نظم طباطبائی حیات اور کارناموں کا تنقیدی جائزہ'' لکھا۔ لیکن 1969 میں پروفیسر رفیعہ سلطانہ کی زیرنگرانی میں یہ مقالہ مکمل کرکے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ بحیثیت اردو لکچرر ''ونیتا مہاودیالیہ'' میں 1970 میں تقرر ہوا۔ اس ادارے میں وہ آٹھ سال تک درس و تدریس کے کاموں میں مشغول رہیں۔

یکم نومبر 1977 کو جامعہ عثمانیہ میں اشرف رفیع کا تقرر بحیثیت لکچرر ہوا۔ 1984 میں ریڈر مقرر ہوئیں۔ 1989 میں پروفیسر شپ ملی اور 1990 میں صدر شعبہ اردو کے عہدہ پر فائز ہوئیں۔ 1992 میں بورڈ آف اسٹیڈیز (B.O.S) کی چیر پرسن بنائی گئیں۔ زمانہ صدارت میں تانیثیت (Faminism) دکنی مثنویوں اور جنوبی ہند میں منظر پس منظر پر تین کل ہند سمینار کا انعقاد کیا۔ 1996 میں پروفیسر اشرف رفیع دوبارہ صدر شعبہ مقرر ہوئیں۔ 31 دسمبر 1997 کو بحیثیت صدر شعبہ اردو ملازمت سے سبکدوش ہوئیں۔ وہ بحیثیت شاعرہ قومی سطح پر اپنی ایک پہنچان رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ دکنیات اور لسانیاتی تحقیق میں انہیں اہم مقام حاصل ہے۔ اشرف رفیع کی شخصیت پرکشش اور دلکش ہے۔ طالب علم ان سے بار بار ملنے کے خواہاں رہتے ہیں۔ وہ ایک پرخلوص، ہمدرد، حرکیاتی اور وقت کی پابند خاتون ہیں۔

اشرف رفیع ایک ہمہ گیر شخصیت ہیں۔ عالم فاضل، دانشور قابل منتظم اور بہترین مقرر ہیں۔ اس کے علاوہ آرٹ اور موسیقی سے بھی انہیں خاصی دلچسپی ہے۔ ستار بجانے میں انہیں کمال حاصل ہے۔ ان کا شمار عصر نو کی اہم اور دانشور شاعرات میں ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اشرف رفیع نے سب سے پہلے نسائی حسیت جیسے موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ انھوں نے اپنے عمیق مشاہدے کی بنا پر نظموں میں خواتین کے مسائل کو اجاگر کیا۔ ڈاکٹر اشرف رفیع کے موضوعات تحقیق و تنقید، فن عروض اور لسانیات رہے ہیں۔ عموماً ان کی تصانیف کا محور انہیں موضوعات اردگرد رہا ہے۔ سادہ سلیس زبان میں وہ اپنے خیالات کو پیش کرنے کی سعی کرتی ہیں۔ پروفیسر اشرف رفیع صاحبہ نے اپنی کتاب ''تلاش زبان و ادب'' کے ایک مضمون ''اُردو غزل: ابتدائی نقوش'' میں اردو غزل کے حوالے سے روشنی ڈالتے ہوئے یوں لکھا ہے:

''اردو شاعری کی مختلف اصناف کی طرح غزل بھی عربی اور فارسی کے وسیلے سے اردو میں آئی، غزل کا مزاج عربوں کے

ذ ہنی رویہ سے زیادہ میل نہ رکھا۔ فارسی میں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ فارسی نے غزل کو اور غزل نے فارسی کو کچھ اس طرح اپنالیا کہ ایرانی تہذیب کے آثار، اموراور عوامل غزل کے آئینہ میں صاف نظر آنے لگے۔ ویسے ہر زبان کا ادب اپنی تہذیب وتمدن کا آئینہ دار ہوتا ہے لیکن غزل کو اس کے زیادہ مواقع حاصل ہیں۔ کیونکہ اس کا گزر خلوت اور جلوت دونوں جگہ یکساں ہے۔''

(تلاش زبان وادب، ڈاکٹر اشرف رفیع، جنوری 1999 چادر گھاٹ حیدرآباد، ص 84)

اُردو شاعری کی متعدد اصناف عربی اور فارسی کے وسیلے سے اردو میں آئی ہیں۔ صرف غزل کے لیے عربوں کا مزاج صحیح سے نہ بن پایا اس لیے انھوں نے غزل کو یک طرفہ چھوڑ دیا، فارسی والوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس صنف کو معراج بخشا۔ فارسی نے غزل کو اتنا مالا مال کیا کہ بہت بڑے شعرا فارسی میں نمودار ہوئے اور ایران کی تہذیب وتمدن کے مکمل آثار نظر آئے۔ چوں کہ ہر زبان اپنی تہذیب وتمدن کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ غزل کا میدان بہت وسیع ہے کیونکہ اس میں عشق ومحبت، دردوغم، مفلسی، بھوک، تشدد، یاس وحسرت کے علاوہ اور بھی ایسے موضوعات شامل کیے جاتے ہیں جن کا تعلق سماج سے ہو یا سماج کے باہر ہو۔ پروفیسر اشرف رفیع نے متذکرہ مضمون میں شمالی ہند میں اردو غزل کی روش پر بات کرتے ہوئے اس طرح لکھا ہے:

''محمد قلی قطب شاہ سے پہلے فیروز اور ملا خیالی کے بھی غزلیہ اشعار مل جاتے ہیں۔ شمالی ہند میں اس وقت تک جو غزل کہی جاتی رہی ہے اس میں غزل کی روح نہ مل سکی۔ دکن کے شاعروں نے فارسی سے غزل کا نہ صرف سانچہ لیا بلکہ ان کی تخلیقی قوت بھی حاصل کی اور غزل کو رنگ وآہنگ دیا۔''

(تلاش زبان وادب، ڈاکٹر اشرف رفیع، جنوری 1999 چادر گھاٹ حیدرآباد، ص 91)

مندرجہ بالا اقتباس میں پروفیسر اشرف رفیع یہ کہنا چارہی ہیں محمد قلی قطب شاہ سے پہلے بھی غزلیہ اشعار ملا خیالی کے ہاں بھی ملتے تھے۔ اس دور میں شمالی ہند میں اردو غزل جو کہی جارہی تھی اس میں وہ اثر اور پختگی نہ تھی جو دکن کے شعرا کے ہاں ملتی ہے۔ دکنی شعراء کے ہاں اردو غزل کا سانچہ جو فارسی سے لیا گیا تھا کے ساتھ اور بھی نئی چیزیں ملتی تھی۔ انھوں نے تخلیقی وجدان سے اردو غزل کو نیا رنگ وآہنگ بخشا۔ یہی فرق ہے شمالی ہند اور دکن کے شعرا میں، اسی فرق سے دکنی شعرا کو شمالی ہند کے شعرا کے بجائے فوقیت زیادہ ملی۔ پروفیسر اشرف رفیع نے ایک اور مضمون بعنوان ''شاہ تراب کی غزل'' میں شاہ تراب کی خوبیوں کو اجاگر کرتے ہوئے ان کے صوفیانہ اثر کو بیان کرتے ہوئے یوں رقم کیا ہے:

''شاہ تراب کے یہاں تشبیہ استعارہ، تلمیح اور دیگر صنائع بدائع کا استعمال شدت سے ملتا ہے۔ ان کی زبان ٹھیٹ دکنی ہے۔ شاہ تراب کی غزل مواد کے اعتبار سے انفرادیت رکھتی ہے۔ دکنی دور میں ولی بلکہ ولی سے بڑھ کر سراج کے پاس صوفیانہ رنگ چھایا ہوا ہے۔ شاہ تراب سراج سے بھی آگے نکل گئے ہیں ان کے یہاں تصوف کے گہرے نکات ،موضوعات اور صوفیانہ مزاج چھایا ہوا ہے۔''

(لفظوں کی احساس، پروفیسر اشرف رفیع، ایس۔ کے پرنٹرس حمایت نگر حیدرآباد 2015، ص 20)

شاہ تراب کی غزلوں میں جو چیزیں کثرت سے ملتی ہیں وہ اس طرح سے ہیں کہ: تشبیہ، استعارہ، تلمیح کے ساتھ ساتھ صنائع بدائع کی کئی اصطلاحیں وغیرہ۔ ڈاکٹر اشرف رفیع صاحبہ نے شاہ تراب کی غزلوں کا موازنہ دوسرے شعرا کے کلام کے ساتھ کرکے انہیں بہترین صوفی شاعر قرار دیا ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ ولی سے بڑھ کر سراج اورنگ آبادی صوفیانہ شاعری کے مالک تھے جب کہ سراج کے آگے بھی شاہ تراب نکل گئے۔ ان کی شاعری میں تصوف کے نئے مضامین، گہرے فلسفے، اور صوفیانہ

مزاج عروج پر نظر آتا ہے۔اسی مضمون ''شاہ تراب کی غزل'' میں آ گے ایک اور جگہ اشرف رفیع صاحبہ نے مزید شاہ تراب پر تفصیل سے وضاحت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''بحیثیت سجادہ نشین ان کا ربط عوام کے ہر طبقے سے رہا ہے۔ اس لیے ان کے کلام کا لسانی مطالعہ بھی اس عہد کے لسانی رجحانات کو سمجھنے میں مدد دے گا۔دکن کے اکثر شاعروں نے اپنے اپنے عہد کے تہذیبی اقدار کو اپنے کلام کے ذریعہ محفوظ رکھنے کی کوشش کی ہے مگر شاہ تراب نے صرف تہذیب کے صوفیانہ پہلو پر خاص توجہ صرف کی ہے۔کہیں کہیں اس عہد کی عام اخلاقی اور روحانی کمزوریوں کی بھی نشاندہی ہو جاتی ہے۔''

(لفظوں کی احساس، پروفیسر اشرف رفیع،ایس۔کے پرنٹرس حمایت نگر حیدر آباد 2015،ص 20)

مندرجہ بالا اقتباس میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شاہ تراب نے بھی اپنی تہذیبی اقتدار کو محفوظ کرنے کی مکمل کوشش کی ہے۔جس طرح باقی شعرا نے اپنے کلام میں تہذیبی نمونوں کو محفوظ رکھا۔اب اگر ہمیں اس عہد کی زبان جاننی ہو تو ان کے کلام سے ہمیں بھرپور مدد ملے گا۔کیونکہ ان کے کلام میں وہ سارے موضوعات درج ہیں جن سے اس دور کی زبان سمجھنے میں آسانی ہو۔ وہ الگ بات ہے کہ شاہ تراب اپنی تہذیب کے صرف صوفیانہ پہلوؤں کو نمایاں کرنے میں محو رہتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ اس عہد کی عام اخلاقی اور روحانی کمزوریوں کی بھی نشاندہی ملتی ہے۔پروفیسر اشرف رفیع نے مضمون ''مثنوی قطب مشتری (چند لسانی اور اسلوبیاتی خصوصیات)'' میں مثنوی قطب مشتری پر اپنے تاثرات بیان کرتے ہوں یوں لکھا ہے:

''قطب مشتری میں اس کی مضمون آفرینی، ندرت خیال، جہاں بانی اور جہاں داری اسلوب کی تازگی، سادگی، تشبیہات استعارات، تراکیب، لفظیات اور لسانی خصوصیات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وجہی ایک قادرالکلام شاعر ہے۔اس نے اپنی مثنوی میں تعالٰی کی ہے، اس میں لاف زنی کا کوئی شائبہ نہیں بلکہ یہ اس کا حق تھا یہ اس کی خودشناسی تھی، قطب مشتری میں تاریخی، تہذیبی، دیو مالائی اور اسلامی عناصر ایک دوسرے کے ساتھ ملے جلے نظر آتے ہیں۔''

(لفظوں کی احساس، پروفیسر اشرف رفیع،ایس۔کے پرنٹرس حمایت نگر حیدر آباد 2015،ص 46)

دکن کے مشہور و معروف شاعر اور نثر نگار ملا وجہی کی مثنوی قطب مشتری کی خوبیوں کو بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر اشرف رفیع نے اس اقتباس میں مثنوی کی مختلف چیزوں پر بات کی ہے۔جیسے کہ مضمون آفرینی، ندرت خیال، جہاں بانی، جہاں داری اسلوب کی تازگی، سادگی تشبیہات، استعارت، تراکیب، لفظیات اور لسانی خصوصیات غرض تمام چیزوں کو اجاگر کیا گیا۔ان تمام خصوصیات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وجہی ایک قادر الکلام شاعر مانے جاتے ہیں۔ملا وجہی نے اس مثنوی میں تاریخی، تہذیبی، دیو مالائی اور اسلامی عناصر کو ایک دوسرے کے ساتھ ملایا ہے تاکہ مثنوی کا تسلسل برقرار رہے۔پروفیسر اشرف رفیع صاحبہ نے مثنوی قطب مشتری پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے مزید اس طرح لکھا ہے:

''وجہی نے قطب مشتری میں افعال سے بہت کام لیا ہے یہ افعال 75 فیصد مقامی اور دیسی زبانوں ہی کے استعمال میں آئے ہیں۔اسما صفات میں وہ فارسی، عربی اور سنسکرت سے استفادہ کرتا ہے۔قطب مشتری کی نحوی ساخت غیر معمولی موزونیت طبع کا پتہ دیتی ہے۔یہ زبان کی مروجہ ساخت سے بہت قریب ہے۔جملوں اور لفظوں کی ترتیبِ گفتگو کی ترتیب سے دور نہیں۔''

(لفظوں کی احساس، پروفیسر اشرف رفیع،ایس۔کے پرنٹرس حمایت نگر حیدر آباد 2015،ص 49)

ملا وجہی نے قطب مشتری میں کرداروں سے بہت کم کام لیا ہے۔ اب جو کردار استعمال ہوئے ہیں وہ زیادہ تر دیسی زبانوں میں ہی گفت شنید کرتے ہیں۔جیسے کہ فارسی، عربی اور سنسکرت کے صفات سے ہی کام لیتے ہیں۔قطب مشتری کی نحوی ساخت غیر معمولی موزونیت طبع کا پتہ دیتی ہے اگر چہ یہ زبان کی مروجہ ساخت سے نزدیک ہے بلکہ جملوں اور لفظوں کی ترتیبِ گفتگو سے دور نہیں ۔الغرض ڈاکٹر صاحبہ نے فنی لوازمات کا بغور مطالعہ کر کے اس مثنوی پر قلم اٹھایا ہے اور اس مثنوی اور مثنوی نگار پر اپنی متذکرہ رائے پیش کی ہے۔اسی طرح حیدر آباد کے بڑے ادیب کے فن پر انھوں نے اپنا تنقیدی نقطۂ نظر کئی طرح سے پیش کیا۔مضمون ''مغنی تبسم۔ ماہر اسلوبیات ۔۔۔ایک مطالعہ'' میں اسلوبیات پر بحث کرتے ہوئے پروفیسر اشرف رفیع یوں لکھتی ہیں:

''اسلوبیات توضیحی لسانیات کا موضوع ہے۔ہمارا قدیم ادبی سرمایہ اس طرح کے اسلوبیاتی مطالعہ سے خالی نہیں ہے۔ ہمارے بزرگوں کا طریق کار بیانیہ اور غیر تجزیاتی تھا۔خالص لسانیاتی اعتبار سے اردو میں اُسلوب اور اسلوبیاتی مسائل پر اب تک بہت کم لکھا گیا ہے۔اسلوبیات میں زبان کی ہیئت، ساخت اس کے مزاج کی توضیح اور تحلیل سے مدد لی جاتی ہے۔اس تجزیہ کا خاص مقصد کسی ادبی فن پارے کی مقبولیت

اور انفرادیت میں اُس زبان کی مختلف اصوات کے رول کو واضح کرنا ہے۔"

(لفظوں کی احساس، پروفیسر اشرف رفیع، ایس۔کے پرنٹرس حمایت نگر حیدرآباد 2015، ص 127)

توضیحی لسانیات کا ایک موضوع اسلوبیات بھی ہے، اگر ہم غور کریں گے تو قدیم سرمایہ ادب اسلوبیاتی مطالعے سے خالی نہیں ہے۔ پہلے پہل ادیبوں کا طریقہ کار بیانیہ اور غیر تجزیاتی رہا ہے، صرف لسانیات کے حوالے سے اردو میں اسلوب اور اسلوبیاتی مسئلوں پر اب تک بہت کم لکھا گیا ہے۔ اسلوبیات کی تعریف یوں ہے کہ اس میں زبان کی ہیئت، ساخت، اس کے مزاج کی توضیحی اور تحلیل پر بات ہوتی ہے۔ اسلوبیات میں جب تجزیہ پیش کرتے ہیں تو اس کا مقصد کسی ادب پارے کی شہرت اور خصوصیت میں اس زبان کی مختلف اصوات کے رول کو واضح کیا جاتا ہے۔ اسلوبیات کے علم سے ہی ہم ادب پارے کی اصلی پہچان کر پاتے ہیں اور زبان کا قدر و تعین بھی صحیح سے ہو پاتا ہے۔ مضمون "انجمن کی چار درسی کتابیں (تلفظ و املا کا مسئلہ)" میں رموز و اوقاف پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر اشرف رفیع نے یوں لکھا ہے:

"ہمارا خیال ہے کہ اردو ریڈرس میں دوسرے مضامین جیسے سائنس، جغرافیہ، تاریخ وغیرہ مضامین نہیں ہونا چاہیے۔ کم از کم پرائمری اور اپر پرائمری سطح تک کتابیں کہانیوں قصوں اور دلچسپ مضامین پر مبنی ہونی چاہیے۔ آج ہماری کتابوں میں رموز اوقاف، علامتوں اور اعراب کا قطعی خیال نہیں رکھا جاتا جب کہ اس کی ضرورت آج ہمارے اساتذہ کو بھی ہے۔ علامتیں، اعراب، رموز اوقاف کی یکسانیت کی پابندی لازمی ہے تاکہ بچہ املا کی اختلافی صورت سے ذہنی الجھن میں مبتلا نہ ہوسکے۔"

(لفظوں کی احساس، پروفیسر اشرف رفیع، ایس۔کے پرنٹرس حمایت نگر حیدرآباد 2015، ص 156)

اس اقتباس میں پروفیسر اشرف رفیع کا کہنا ہے کہ اردو ریڈرس میں دوسرے مضامین جیسے سائنس، جغرافیہ، تاریخ وغیرہ کو ہٹا دینا چاہیے۔ پرائمری سطح تک کتابیں صرف قصوں، کہانیوں، دلچسپ مضامین پر ہی ہونی چاہیے نہ کہ دوسرے مضامین ان میں شامل ہوں۔ دورِ حاضر میں رموز اوقاف، علامتوں اور اعراب کا خیال نہیں رکھا جاتا ہے جب کہ اس کی اشد ضرورت آج کے اساتذہ کو بھی ہے۔ یہاں پر پروفیسر صاحبہ نے اس بات کی طرف زور دیا ہے کہ علامتیں، اعراب، رموز اوقاف کی پابندی لازمی ہے تاکہ بچے املا کی غلطی نہ کریں اور ذہنی الجھن میں مبتلا نہ ہو پائیں۔

"یعقوب میراں مجتہدی کی لغت" پر مضمون میں پروفیسر اشرف رفیع نے اس لغت کی خوبیوں کو اجاگر کرتے ہوئے یوں قلم بند کیا ہے:

"لغت خواہ ایک لسانی ہو یا ذولسانی اس میں ذخیرۂ الفاظ اور اس کی تہذیب و ترتیب لیے لفظ کے ہجا یا املا کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اردو میں عام طور پر لفظوں کا املا طے شدہ ہے لیکن بعض الفاظ کے املا میں اختلاف بھی ملتا ہے۔ میراں مجتہدی نے ہر لفظ کا مستند املا دیا ہے۔ تلفظ کے تعین کے لیے اعراب لگائے ہیں۔ اختلافِ تلفظ کی نشاندہی کی ہے۔ املا کے تعین کے بعد تلفظ کی ادائیگی کا مسئلہ آتا ہے۔ اصوات کی شناخت کے لیے علامات کا استعمال کیا گیا ہے۔"

(لفظوں کی احساس، پروفیسر اشرف رفیع، ایس۔کے پرنٹرس حمایت نگر حیدرآباد 2015، ص 168)

مندرجہ بالا اقتباس میں یہ پڑھنے کو ملتا ہے کہ لغت چاہے یک لسانی ہو یا ذولسانی اس میں ذخیرۂ الفاظ کی ترتیب کے ساتھ ساتھ ہجا یا املا کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اردو کے لفظوں کا املا تقریباً مقرر ہے لیکن کئی الفاظ کے املا میں اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ متذکرہ لغت نویس نے بڑی کوشش کی ہے کہ ہر لفظ کا مستند املا پیش کرے اور ساتھ ہی لفظوں کے لیے اعراب بھی متعین کیے ہیں۔ انھوں نے بعض لفظوں کے اختلافِ تلفظ بھی درست کیے ہیں۔ لغت میں املا کے تعین کے بعد تلفظ کی ادائیگی کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اصوات کی شناخت کے لیے علامات کا استعمال کیا جاتا ہے۔

الغرض پروفیسر اشرف رفیع تلنگانہ میں ایک ہمہ جہت شخصیت کے طور پر نمایاں ہے۔ جہاں کہیں بھی بڑی تقریب کا انعقاد ہوتا ہے تو پروفیسر اشرف رفیع کا مسکراتا چہرہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ انھیں کانفرسوں، سیمناروں، مشاعروں اور بین الاقوامی سیمنارں میں بھی صدارتِ محفل کے طور پر مدعو کیا جاتا ہے، اردو ادب کے تئیں انھوں نے دل و جان سے اور بڑی محنت و مشقت کے ساتھ کارنامے انجام دیے ہیں۔ عمر درازی کے باوجود آج بھی ادبی و شعری سرگرمیوں میں حصہ لے کر اپنے فرائض بہ حسن خوبی سے انجام دیتی ہیں۔

□□□

Dr. Nazir Ahmad Ganai
S/O Gh Hassan Ganai
R/O Frisal Kulgam-192232 (Jammu & Kashmir)
Mob: 7889779687

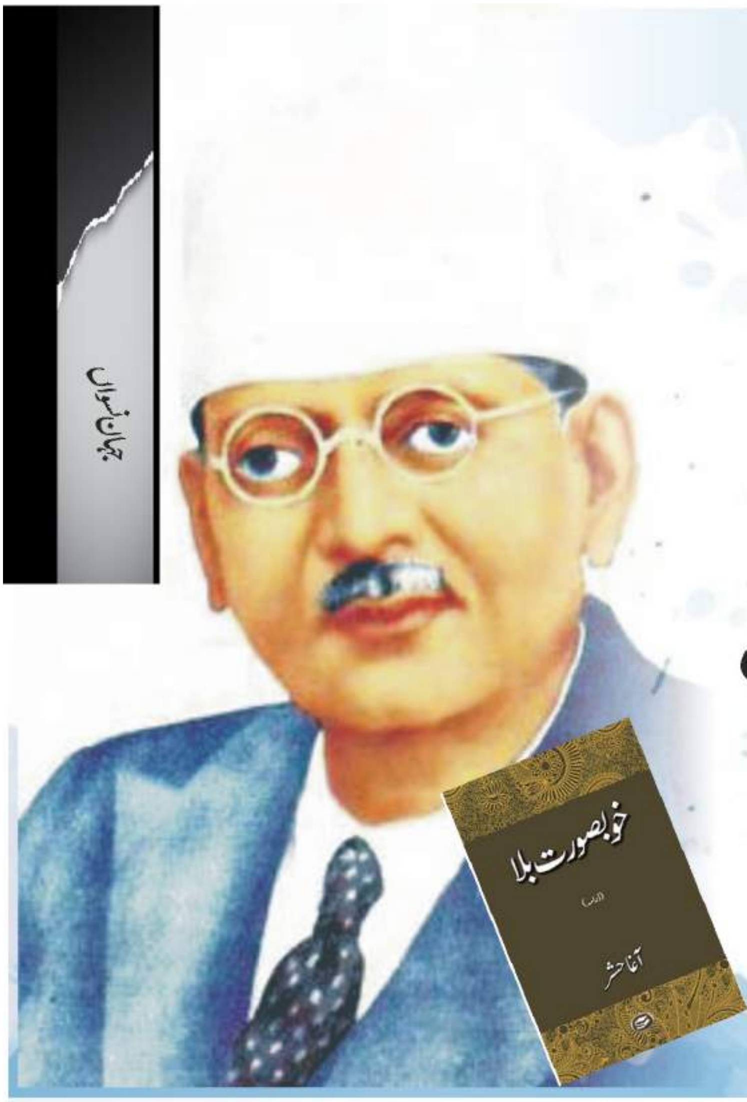

عبدالرحمٰن

''خوبصورت بلا'' کا نمائندہ کردار شمسہ

ڈراما ''خوبصورت بلا'' آغا حشر کاشمیری نے 1909 میں نیو الفریڈ کمپنی کے لیے لکھا اور اسی سال یہ اسٹیج بھی ہوا۔ یہ ڈراما اتنا مقبول ہوا کہ آغا حشر کی شہرت اس کی وجہ سے دور دور تک پھیل گئی۔ اس ڈرامے نے آغا حشر کی زندگی کے ساتھ ساتھ ڈرامے کی دنیا میں بھی ایک انقلاب برپا کر دیا تھا۔ اس سے پہلے انھوں نے جو ڈرامے لکھے تھے مثلاً ''اسیر حرص''، ''شہید ناز''، ''سفید خون''، ''صید ہوس'' اور ''خواب ہستی'' وغیرہ، جو کامیاب تو ہوئے تھے لیکن یہ ایک خاص طرز کے درباری ڈرامے تھے، جو زبان واسلوب اور مکالمے وغیرہ کے اعتبار سے بھی تقریباً ایک جیسے تھے۔ خوبصورت بلا کا پلاٹ بھی درباری ہے لیکن آغا حشر نے اس کے ذریعہ اردو ڈرامے میں کئی اہم تجربے کیے، جو انتہائی کامیاب ثابت ہوئے۔ فنی سطح پر اگر ان کے پچھلے ڈراموں پر غور کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ ان کے مکالمے بہت طویل ہوتے تھے اور ان کی زبان خطیبانہ تھی۔ مسجع ومقفع نثر کا استعمال خوب ہوتا تھا اور مکالموں کے درمیان بے جا اشعار کا استعمال، یہاں تک کہ منظوم مکالمے بھی ہوتے تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ڈراموں میں گانوں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہوتی تھی۔ یہ تمام چیزیں کہیں نہ کہیں ڈرامے کے فن کو مجروح کر رہی تھیں۔ آغا حشر نے ان کا بغور جائزہ لیا اور اس ڈرامے کے ذریعہ ان فنی کمزوریوں کو بہت حد تک دور کرنے کی کوشش کی۔ ساری چیزوں کو یک لخت ڈرامے سے ختم تو نہیں کیا، تاہم ان میں بہت کچھ کمی بیشی کر دی۔ یہی وجہ تھی کہ یہ ڈراما ان کے پچھلے تمام ڈراموں میں سب سے زیادہ مقبول ہوا۔

اس ڈرامے کے کرداروں میں شمسہ، توفیق، قتلو، طاہرہ، سہیل، طغرل، شہریار اور قہرمان وغیرہ اہم ہیں۔ آغا حشر کے اکثر ڈراموں کی طرح اس ڈرامے میں بھی ایک مزاحیہ قصہ ساتھ ساتھ چلتا ہے، لیکن اس کی خاص بات یہ ہے کہ آغا حشر نے مزاحیہ پلاٹ کو سنجیدہ پلاٹ سے جوڑ کر پیش کیا ہے، جس سے ان دونوں میں ایک ربط بنا رہتا ہے۔ مزاحیہ کرداروں میں خیر سلاّ، ماشاءاللہ، ڈالی، اور ممتاز کے کردار اہم ہیں۔ شمسہ، طغرل اور قتلو اس ڈرامے کے منفی کردار ہیں۔ کرداروں پر گفتگو سے قبل اس ڈرامے کا مختصر خلاصہ بیان کر دینا مناسب ہوگا۔

شمسہ ایک چالاک، مکار اور ظالم شہزادی ہے، جو تاج وتخت کی ہوس میں پہلے اپنے شوہر کو زہر دے کر مار دیتی ہے اور پھر سگے بھائی کو

دھوکے سے قتل کرا دیتی ہے۔اس کے بھائی کا لڑکا 'سہیل' جو تخت وتاج کا اصل وارث ہے لیکن اس کے نابالغ ہونے کی وجہ سے شمسہ خود ہی سلطنت پر قبضہ کر لیتی ہے اور اس فکر میں لگ جاتی ہے کہ کیسے سہیل کو بھی راستے سے ہٹایا جائے۔ توفیق جو سہیل کے باپ کے وقت کا ایک وفادار جنرل ہے، شمسہ کی نیت کا اندازہ لگا کر سہیل کو اپنی بیوی طاہرہ کے پاس چھپا دیتا ہے، جس کے جرم میں شمسہ توفیق کو قید کر لیتی ہے۔ جنرل مہربان کی مدد سے توفیق قید سے فرار ہو جاتا ہے اور اپنی فوج جمع کر کے شمسہ سے مقابلہ کرتا ہے، لیکن شکست کا اندازہ کر کے سہیل کو ایک وفادار سپاہی ہشام کے ساتھ بھگا دیتا ہے اور اپنی بیوی طاہرہ سے کہتا ہے کہ اگر شمسہ کی فوج قلعہ میں داخل ہوئی تو سہیل کی جگہ اپنے بیٹے کو پیش کر دینا۔ بالآخر شمسہ کا سپہ سالار طغرل، توفیق کے بیٹے رشید کو سہیل سمجھ کر قتل کر دیتا ہے اور اس کے ساتھ ہی توفیق بھی مارا جاتا ہے۔ اس طرح توفیق اپنے مالک کے بیٹے کو بچانے کے لیے خود بھی قربان ہو جاتا ہے اور اپنے لختِ جگر کو بھی نثار کر دیتا ہے۔ ادھر سہیل ہشام کے ساتھ جنگل میں چھپ کر رہ رہا ہوتا ہے کہ شمسہ کے سپاہی سہیل کو پکڑ کر قید کر لیتے ہیں۔ شمسہ قلو کے ساتھ منصوبہ بناتی ہے کہ سہیل کو جس جگہ قید کیا گیا ہے اس میں بارود لگا کر پورا مکان دھماکے سے اڑا دیا جائے تاکہ رعایہ کو اندازہ بھی نہ ہو کہ سہیل کے مارنے میں اس کا ہاتھ ہے۔ وہ اس کے بدلے قلو سے شادی کا جھوٹا وعدہ بھی کرتی ہے، لیکن دل ہی دل میں یہ منصوبہ بھی بناتی ہے کہ سہیل کی موت کے بعد وہ قلو کو بھی راستے سے ہٹا دے گی۔ ادھر طاہرہ شہریار کی مدد سے سہیل کو قید خانے سے چھڑانے کے لیے نقب لگاتی ہے، لیکن عین وقت پر شمسہ وہاں پہنچ جاتی ہے۔ طاہرہ شمسہ سے سہیل کی زندگی کی بھیک مانگتی ہے، لیکن شمسہ اسے ٹھکرا کر چلی جاتی ہے۔ موقع دیکھ طاہرہ اور شہریار سہیل کو مکان سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اسی وقت طغرل مکان میں داخل ہوتا ہے کہ اچانک بارود پھٹنے سے مکان گر جاتا ہے اور طغرل اس میں دب کر مر جاتا ہے۔ عین وقت پر قہرمان اپنی فوج کے ساتھ چڑھائی کرتا ہے، شمسہ اور قلو قید کر لیے جاتے ہیں۔ طاہرہ چاہتی ہے کہ اگر شمسہ اور قلو معافی مانگ لیں تو انھیں معاف کر دیا جائے گا۔ لیکن شمسہ ایک انا پرست اور گھمنڈی عورت ہے۔ وہ کسی کے آگے جھک کر معافی مانگنا اپنی بے عزتی سمجھتی ہے۔ اس لیے جب اسے احساس ہوتا ہے کہ قلو اپنی زندگی کے لیے معافی مانگنے کو تیار ہے تو وہ اسے گولی مار کر خود بھی مر جاتی ہے۔ اس طرح ایک گھمنڈی، انا پرست اور تاج وتخت کی ہوس رکھنے والی عورت کی موت پر ڈراما اپنے اختتام کو پہنچتا ہے۔

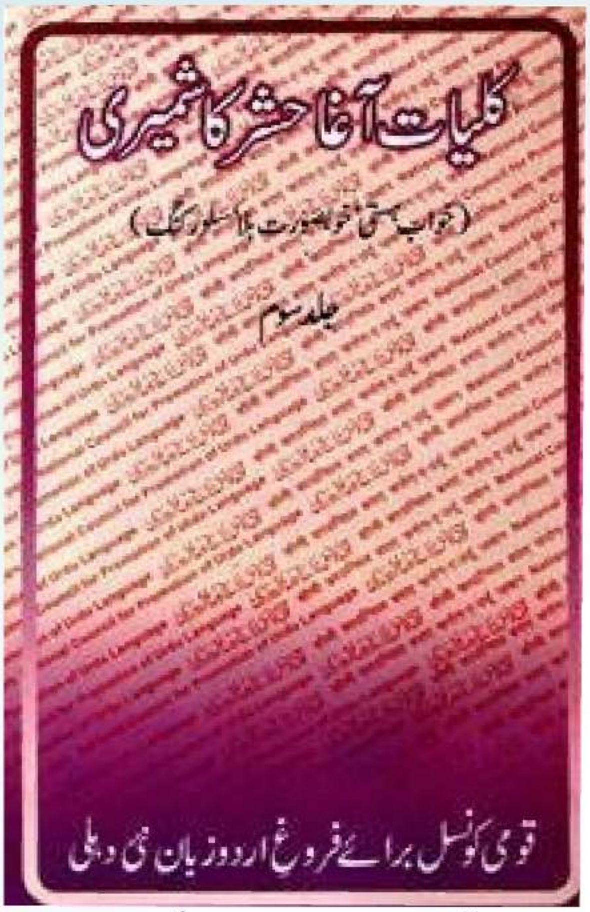

اس مختصر سے خلاصے سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس ڈرامے کا کردار ''شمسہ'' کتنی اہمیت کا حامل ہے۔ پورا ڈراما اسی ایک کردار کی وجہ سے عمل وحرکت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ شمسہ ایک اقتدار پسند عورت ہے جو سلطنت حاصل کرنے کے لیے کسی بھی حد تک جانے کو تیار ہے۔ اس کی یہی ہوس اور خواہش اس ڈرامے کے پلاٹ کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ جو بھی اس کے راستے میں آتا ہے جان سے جاتا ہے۔ وہ اتنی خودغرض ہے کہ اپنے مقصد کے لیے محبت کا ناٹک کرتی ہے اور قلو سے شادی کا جھوٹا وعدہ بھی کرتی ہے، لیکن اسے نہ تو محبت چاہیے اور نہ ہی اس کی آزادی کو چھیننے والا کوئی شوہر چاہیے۔ ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

قلو: پیاری شمسہ وہ شادی کا قول؟

شمسہ: میرے وعدے پر یقین رکھو۔ سہیل کے مرتے ہی تم شمسہ کے اور شمسہ تمہاری ہے۔ (قلو کا جانا)

بے وقوف الو کے پٹھے۔ میرے کھیلنے کے کھلونے۔ میں نے اپنے شوہر کو زہر دے کر دنیا سے رخصت کیا۔ کیوں؟ اپنی آزادی کے لیے۔ میں نے اپنے سگے بھائی کو بیدردی سے

تیرے ہاتھوں ذبح کرایا۔ کیوں؟ سلطنت کے لیے، مگر تو یہ چاہتا ہے کہ شادی کے ذریعہ شمسہ کو اپنے اختیار میں لا کر اسے ان دونوں نعمتوں سے محروم کردے۔ ٹھہر جا بے وقوف۔ سہیل کی موت تک ٹھہر جا۔ جس منہ سے بیوی کہنا چاہتا ہے۔ وہ قبر کی مٹی سے بھر دیا جائے گا۔ چند ہی روز میں تیرا خاتمہ بھی کر دیا جائے گا۔

(آغا حشر کاشمیری؛ ڈراما خوبصورت بلا، مشمولہ: کلیات آغا حشر کاشمیری جلد سوم، 2004، ص 262)

شمسہ ظالم ہونے کے ساتھ ساتھ نڈر اور بہادر بھی ہے، بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ وہ انتہا درجے کی انا پرست ہے۔ وہ کسی بھی حال میں گھبراتی نہیں ہے۔ جب اپنے مقصد میں ناکام ہوتی ہے تو اسے بھی قسمت اور قدرت کا ابدی قانون سمجھ کر اپنی شکست تسلیم کر لیتی ہے، لیکن اپنے مخالف سے معافی مانگنا اس کے شایانِ شان نہیں۔ وہ ٹوٹ سکتی ہے لیکن جھک نہیں سکتی۔ اس کا اپنا اصول ہے چاہے شکست ہو یا فتح وہ اپنی آزادی اور انا کے آگے کسی سے بھی سمجھوتہ نہیں کرتی۔ وہ طاہرہ سے کہتی ہے:

شمسہ: گرمی کے بعد سردی، دن کے بعد رات، طلوع کے بعد غروب، پیدا ہونے کے بعد مرنا، کھلنے کے بعد مرجھانا اور انتہائے بلندی پر پہنچنے کے بعد نیچے آنا قدرت کا قانون ہے۔ اس لیے اگر میں اپنے اس حال کو دیکھ کر افسوس کروں تو احمق ہوں اور اگر تو خوش ہوتی ہے تو مجنوں ہے۔

(ایضاً، ص 270.271)

جب اسے لگتا ہے کہ طاہرہ اسے معاف کر دے گی، اور اس کا ساتھی قتلو بھی معافی مانگنے کو تیار ہے، تو یہ اسے اپنی آبرو اور انا کی ہتک سمجھتی ہے، اسے یہ شرمندگی گوارا نہیں ہوتی، اس لیے قتلو کو گولی مارنے کے بعد خود کو بھی ہلاک کر لیتی ہے۔ اس طرح مرنے کو وہ عزت سے مرنا تصور کرتی ہے:

شمسہ: قتلو خبردار۔ عزت میں پیدا ہوا۔ عزت میں جیا اور عزت ہی میں مرجانا مگر دشمن کے سامنے جواب دیتے وقت بزدلی نہ دکھانا۔

قتلو: شمسہ بس۔ اب ہم دونوں اس قابل نہ رہے کہ خدا اور انسانوں کو غرور سے جواب دے سکیں۔

شمسہ: قتلو ہوش کر۔ تیری باتوں سے بزدلی کی بو آتی ہے۔۔

قتلو: ناشکر گزار عورت زندگی کی قدر کر۔

شمسہ: بے روشنی کا سورج، بے سورج کی دنیا اور دنیا میں بے حکومت کی زندگی مجھے نہیں چاہیے۔

قتلو: شمسہ۔ تجھے معلوم ہے کہ اس نہیں کا نتیجہ کیا ہوگا؟

شمسہ: صرف موت۔ (ایضاً، ص 271.272)

جب ہم شمسہ کے کردار کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس سے نفرت تو ہوتی ہی ہے لیکن ساتھ ہی یہ کردار بہت متاثر بھی کرتا ہے۔ اس کے اندر ایک کشش ہے۔ آغا حشر نے اس ڈرامے کے ذریعہ دو طرح کی عورتوں کو پیش کیا ہے۔ ایک طاہرہ ہے جو نیک اور شریف خاتون ہونے کے ساتھ ساتھ ایثار و وفا کی پتلی ہے۔ اپنے آقا کے لیے اپنے بیٹے اور شوہر کو بھی قربان کر دیتی ہے۔ تو دوسری طرف شمسہ ہے، جو سلطنت کی ہوس اور طاقت کے نشے میں اپنے شوہر اور سگے بھائی تک کو بھی نہیں چھوڑتی۔ آغا حشر نے ڈرامے کے پہلے سین میں نیکی اور بدی کی جو تمثیل پیش کی ہے اس کی تکمیل وہ ان دونوں کرداروں کے ذریعہ کرتے ہیں۔

فنی نقطۂ نظر سے بھی شمسہ کا کردار خاص اہمیت کا حامل ہے۔ فنی طور پر یہ ایک مثالی اور جامد کردار کے زمرے میں آتا ہے، جس کی فطرت میں شروع سے آخر تک کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ ڈرامے کے شروع میں وہ سازش کر کے ملکہ تو بن جاتی ہے مگر اس کی بادشاہت تا دیر قائم نہیں رہتی اور بالآخر قید کر لی جاتی ہے۔ اس کے باوجود اس کی شخصیت میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ عام طور سے اس طرح کے مثالی کردار حقیقی زندگی میں کم ہی نظر آتے ہیں، اس لیے ناقدین ادب کا خیال ہے کہ جامد اور مثالی کرداروں کے مقابلے متحرک کردار زیادہ اہمیت رکھتے ہیں، جو حالات و واقعات کے حساب سے بدلتے رہتے ہیں، لیکن شمسہ کا کردار اس لیے اہمیت کا حامل ہے کہ اسی کردار کی وجہ سے ڈرامے میں جان باقی رہتی ہے۔ اس کے خطرناک منصوبوں کے ذریعہ ڈراما عملی سطح پر آگے بڑھتے ہوئے نقطۂ عروج کو پہنچ کر اختتام کی جانب بڑھتا ہے۔

آغا حشر نے بڑی باریکی سے شمسہ کے کردار کی تخلیق کی ہے۔ اس طرح کے منفی کردار اور وہ بھی خاتون منفی کردار ہمارے ڈراموں میں بہت کم نظر آتے ہیں۔ ایک منفی کردار میں جتنی برائیاں ہو سکتی ہیں آغا حشر نے سب اس میں جمع کر دی ہیں، اسی لیے انھوں نے اس کو ''خوبصورت بلا'' کا نام دیا ہے۔ شمسہ ایک بے رحم، مکار، دغا باز، چالاک، ظالم اور قاتل عورت ہے۔ وہ اتنی بے رحم اور ظالم ہے کہ جب طاہرہ اس سے پوچھتی ہے کہ ''اگر سہیل تیرا فرزند ہوتا تو کیا یہ ہاتھ اس کے قتل کے لیے رضامند ہوتا'' اس پر شمسہ جو جواب دیتی ہے شاید یہ صرف افسانوں اور ڈراموں کے کردار کا ہی جواب ہو سکتا ہے۔ وہ کہتی ہے:

''ہاں میں وہ عورت ہوں کہ اگر مجھے اپنے دودھ پیتے بچے

سے بھی دنیا میں آگے بڑھ کر کوئی خطرہ ہو تو میں محبت کو طاق پر رکھ دوں اور اس موذی کو زمین پر لٹا کر اسی وقت ذبح کر دوں۔" (ایضاً؛ص 268)

اس انتہا کے باوجود وہ نڈر اور بہادر بھی ہے۔ اپنے حالات کے بدل جانے پر وہ ذرا بھی نہیں گھبراتی اور نہ ہی موت سے ڈرتی ہے۔ ایک منفی کردار میں یہ خاصیت کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ وہ ذلت کی زندگی جینے کے بجائے موت کو گلے لگانا پسند کرتی ہے۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جو اس کردار کے ساتھ ساتھ اس ڈرامے کو بھی دلچسپ بناتی ہیں۔

آغا حشر نے شمسہ کے مکالموں اور زبان پر خاص توجہ دی ہے۔ اس کے مکالمے چھوٹے چھوٹے اور زبان اس کی شخصیت کے عین مطابق ہے۔ جب وہ بولتی ہے تو ایسا لگتا ہے کہ اس کے منہ سے الفاظ نہیں بلکہ انگارے نکل رہے ہیں اور اس بات کو وہ خود بھی تسلیم کرتی ہے۔ توفیق سے گفتگو کرتے ہوئے وہ اپنے بارے میں بتاتی ہے:

سانس سے آگ جو برسائے وہ اژدر ہوں میں
ضد میں طوفان تو غصے میں سمندر ہوں میں
پیس ڈالوں گی مٹا دوں گی فنا کر دوں گی
یاد رکھنا تری تقدیر کا چکر ہوں میں

(ایضاً؛ص 165)

اس کردار کے مکالمے اور زبان کا جائزہ لینے کے لیے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

شمسہ: جاؤ اس ضدی کتے کو میرے سامنے لاؤ۔ ضد کس سے؟ مجھ سے۔ جو طوفانی سمندر کی طرح غصے میں دیوانی ہو جاتی ہے۔ جو دم کے دم میں آندھی کی طرح بلائے ناگہانی ہو جاتی ہے۔ اگر یہ راہ پر نہ آیا تو اس کو اس دنیا میں نہیں رہنا ہے۔

(قلو کا جانا اور توفیق کو پابہ زنجیر سامنے لانا)

شمسہ: کیوں توفیق! کس حال میں ہے۔

توفیق: شیر لوہے کے جال میں ہے۔

شمسہ: سرکش۔

کیوں تباہی لا رہا ہے اپنے عز و جاہ پر
چھوڑ دے کج راہ آجا اب بھی سیدھی راہ پر

توفیق: دنیا میں سیدھی اور سچی راہ صرف نیکی ہے۔ جو قبر کے دروازے سے نکل کر قیامت کے میدان میں سے ہوتی ہوئی بہشت کے دربار میں پہنچاتی ہے۔ باقی ہر ایک راہ ٹھوکریں کھلاتی، کانٹوں میں پھنساتی اور آخر تھکا کر جہنم کے تاریک گڑھے میں گراتی ہے۔

پروا نہیں جو آج زمانہ خراب ہے
رستہ وہی چلوں گا جو ٹھیک اور صاف ہے
دکھ اور خوف ہیچ ہیں میری نگاہ میں
میں خاک بھی جو ہوں گا تو نیکی کی راہ میں

شمسہ: توفیق تو احمق ہو گیا ہے۔

توفیق: ہاں میں احمق ہوں۔ مگر شکر ہے کہ خدا کا باغی، بے وفا، خونی، حرص کا غلام دغاباز اور نمک حرام نہیں ہوں۔

شمسہ: نافرجام بے لگام۔ یہ گستاخانہ کلام۔

(ایضاً؛ص 160.161)

اگر درج بالا اقتباس پر غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ آغا حشر نے مکالموں کے بیچ میں اشعار کا استعمال بھی کیا ہے۔ ساتھ ہی ایک دو مقفع جملے بھی لائیں ہیں، جیسے "کیوں توفیق کس حال میں ہے۔ شیر لوہے کے جال میں ہے۔" "نافرجام بے لگام۔ یہ گستاخانہ کلام۔" اس طرح سے ہم دیکھتے ہیں کہ آغا حشر نے پچھلے ڈراموں کے مقابلے اس ڈرامے میں اشعار کے بے جا استعمال، اور مسجع و مقفع نثر میں کمی تو کی تھی لیکن اسے بالکل ختم نہیں کیا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں اسی طرح کی نثر لکھی جا رہی تھی اور لوگ اس کو پسند بھی کرتے تھے، اس لیے ان کے بعد کے ڈراموں میں بھی جا بجا یہ چیزیں نظر آتی ہیں۔ مندرجہ بالا بحث کے نتیجے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ شمسہ کا کردار نہ کہ صرف آغا حشر کے منفی کرداروں میں ایک خصوصی اہمیت رکھتا ہے بلکہ یہ کردار اردو ڈراموں کے دیگر خاتون منفی کرداروں میں بھی نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔

□□□

Abdur Rahman
Room No: 252
Sutlej Hostel
Jawaharlal Nehru University
New Delhi-110067
Mobile No- 9350491220
email: abdurrahman8971@gmail.com

صائمہ

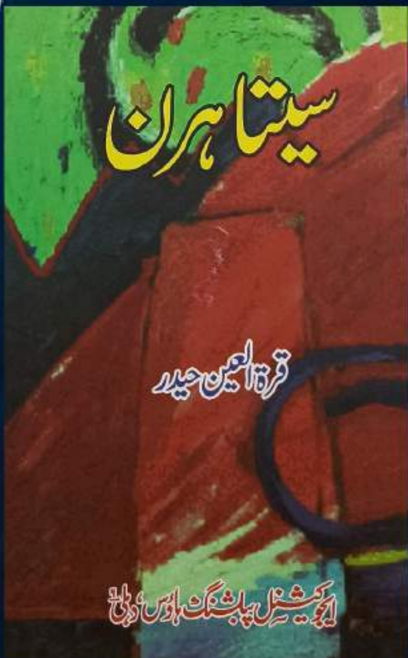

سیتا ہرن میں کرداروں کی مماثلت

فکشن اردو ادب کی ایک اہم صنف ہے۔ دور قدیم سے لے کر دور جدید اور عصر حاضر تک، زندگی اور اس کے مسائل کا بیان و اظہار فکشن میں کیا جاتا رہا ہے۔ اردو ناول نگاری کی تاریخ کوئی زیادہ پرانی نہیں ہے لیکن اس کے باوجود ناول نے اردو ادب میں ایک نمایاں مقام بنایا۔ جس کے سبب اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ اردو ناول نگاری کا آغاز 1869 میں ڈپٹی نذیر احمد کے ناول ''مراۃ العروس'' کی اشاعت سے ہوا۔ یہ ناول نگاری کا تشکیلی دور تھا۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ انسانی مسائل اور ذہن کی تبدیلیوں نے زندگی کے معنی بدل کر رکھ دیے۔ ہندوستان کی معاشرتی، اقتصادی، اخلاقی، سیاسی اور تہذیبی تبدیلی نے انسانی ذہن کو بھی تبدیل کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ سماج شعوری طور پر عورتوں کی تعلیمی ضرورت کو محسوس کرنے لگا تھا۔ خواتین کے متعلق عوام کی رائے تبدیل ہونے لگی تھی۔ اس وقت سماج میں سب سے پیچھے رہنے والا طبقہ خواتین کا تھا۔ چونکہ ادب کسی ایک نقطۂ نظر پر ٹھہرنے کا قائل نہیں ہے۔ لہٰذا ابتدا سے ہی مرد ادیبوں کے علاوہ خواتین ناول نگاروں نے بھی ناول تخلیق کیے۔ گزرتے وقت کے ساتھ تمام ادوار میں خواتین کے مسائل ادبی تخلیقات کا موضوع بنتے رہے ہیں۔

اردو فکشن کے ابتدائی دور میں مصنفین نے سماجی پابندیوں کے دائرے میں رہ کر خواتین کے مسائل کا حل تجویز کیا۔ یعنی ہندوستان کے تہذیبی دائرے کی پاس داری کے ساتھ ہی خواتین کے مسائل کے حل تلاش کیے گئے۔ صحیح معنوں میں مرد اساس سماج نے عورتوں کے لیے تعلیم کی اہمیت اور تعلیم یافتہ خواتین سے ہونے والے فوائد پر اس وقت غور کرنا شروع کیا جب بیسویں صدی میں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اردو فکشن میں دبے

کچلے، مظلوم طبقے کی نمائندگی کی جانے لگی، ان میں خواتین بھی شامل تھیں۔ ہندوستانی سماج میں عورتیں اپنے بنیادی حقوق سے محروم تھیں۔ انھیں محروم خواتین کے مسائل کو پریم چند نے اجاگر کیا۔ لیکن ان کے یہاں خالص خواتین کے موضوعات ہی پیش نہیں کیے گئے، بلکہ ان میں مزدور، کسان اور سماج کے پس ماندہ طبقے کی عکاسی زیادہ غالب نظر آتی ہے۔

ناول نگار خواہ مرد ہوں یا عورت دونوں نے خواتین کے مسائل کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔ خواتین ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں متضاد موضوعات کو جنم دیا۔ خواتین ناول نگاروں نے اپنے عہد کے ادب وسماج سے آنکھیں چار کرتے ہوئے عصری تقاضوں کو ملحوظ رکھا ہے۔ اردو ناول نگاری میں تہذیبی اور لسانی تناظر میں صحت مند ادب تخلیق کرنے کی ذمہ داری کو نبھایا اور اردو ادب میں بہتر سے بہتر ناولوں کی تخلیق کی۔ خواتین کی زندگیوں میں مسائل پیدا ہونے کی مختلف وجوہات تھیں۔ جاگیردارانہ نظام کے خاتمے کے بعد ہندوستان کی آبادی میں متوسط طبقہ ابھر کر سامنے آیا۔ اردو ادب کے بیش تر ناول اسی طبقے سے متعلق لکھے گئے۔ عصمت چغتائی کے یہاں ہمیں خاص طور سے متوسط طبقے کی عورتوں کے مسائل دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں خواتین کے داخلی نفسیاتی مسائل پر خاص توجہ دی گئی۔ ان کے یہاں خواتین اپنے مسائل کی پردہ داری کرنے کے بجائے اس پر کھل کر گفتگو کرتی نظر آتی ہیں۔ خواتین کے مسائل صرف تہذیبی روایات تک ہی محدود نہیں تھے بلکہ ایک طرف عورتیں مرداساس سماج کی بندشوں میں قید تھیں۔ ان تمام کی نمائندگی عصمت چغتائی، صالحہ عابد حسین، جیلانی بانو، بانو قدسیہ، جمیلہ ہاشمی وغیرہ نے اپنے ناولوں میں کی ہے۔

تقسیم ہند کے زیر اثر خواتین کے سامنے کئی مسائل پیدا ہوئے۔ اردو فکشن میں ان مسائل کو بخوبی پیش کیا گیا۔ قرۃ العین حیدر اردو فکشن میں خواتین کے مسائل کو تاریخی، تہذیبی، معاشی وسماجی پس منظر میں پیش کرنے میں مہارت رکھتی ہیں۔ ان کے ادبی شعور اور تخلیقی صلاحیتوں نے ان کی تحریروں کو انفرادیت بخشی۔ انھوں نے ماضی اور اس کی تہذیبی قدروں کو ذہنی اور جذباتی سطح پر ناولوں میں پیش کیا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے ان کے بیش تر ناولوں کا محور ومرکز تقسیم ہند اور اس کا کرب رہا ہے۔ تقسیم ہند کا درد، ماضی کی تصویریں اور انسانی سماج کی حولنا کی ان کے ناولوں کے ذریعہ آشکار ہوتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر انسانی جذبوں کے متعلق بہت حساس نظر آتی ہیں۔ انھوں نے سات ناول 'میرے بھی صنم خانے'، 'سفینۂ غم دل'، 'آگ کا دریا'، 'کار جہاں دراز ہے'، 'آخر شب کے ہم سفر'، 'گردش رنگ چمن' اور 'چاندنی بیگم' لکھے ہیں۔ ان کے ناولوں کا کینوس بہت وسیع ہے اور ان میں تکنیک کے نئے تجربے بھی کیے گئے ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے ناولوں کے علاوہ ناولٹ بھی لکھے ہیں۔ جن میں 'دلربا'، 'سیتا ہرن'، 'اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو' اور 'چائے کے باغ' وغیرہ ہیں، جو خواتین کے مختلف مسائل سے گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔

یہاں ہم قرۃ العین حیدر کے ناولٹ 'سیتا ہرن' کا جائزہ لیں گے۔ ناولٹ کے متعلق لکھنے سے قبل ہم یہ بتاتے چلیں کہ ناولٹ دراصل ناول کی مختصر ترین شکل ہے۔ نثر میں ایسی تحریر جو ناول سے چھوٹی اور افسانے سے بڑی ہوتی ہے۔ اسے چھوٹا ناول یا طویل افسانہ بھی کہا جاتا ہے۔ صنف ناولٹ اور ناول کو الگ کرنے کے کوئی حتمی اصول نہیں ہیں۔ ان کے درمیان حد فاصل کھینچنا مشکل ہے۔ 'آگ کا دریا' لکھنے کے بعد قرۃ العین حیدر نے 'چائے کے باغ' لکھنا شروع کیا تھا۔ لیکن اسے ادھورا چھوڑ کر سر زمین لنکا کے ماحول میں 'سیتا ہرن' لکھنے کا آغاز کیا اور 'سیتا ہرن' ناولٹ 1960 میں مکمل کیا۔ 'مکتبہ اردو ادب لاہور' نے اسے شائع کیا۔ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی ان کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''دراصل قرۃ العین حیدر کا بنیادی زماں ومکان کے تناظر میں عورت کی حیثیت اور اُس کے تصور کو پیش کرنا تھا اسی لیے انھوں نے عورت ذات کو مختلف نقطہ ہائے نظر سے دیکھنے اور پرکھنے کی سعی کی ہے۔ عورت کی وفاشعاری، خودسپردگی، ایثار اور محبت کی بے پناہ وسعتوں کے حصول کی خاطر جو وہ پدرانہ سماج سے چاہتی ہے یہ کتھا قرۃ العین حیدر کے ہر ناول میں کسی نہ کسی صورت میں دہرائی گئی ہے۔ وہ جس بھی مرد سے محبت کرتی ہے یا اُس سے امید رکھتی ہے وہ ابتدائے عشق ہی سے بے وفائی کا مظاہرہ کر کے خود کو بے وفا ثابت کرتا ہے۔ بالآخر عورت تنہائی، بے اعتبار اور فریب خوردگی کے احساس میں مبتلا ہو کر اپنے آپ کو بدنصیب تصور کرتی ہے۔ اس کی زندہ مثالیں ''اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو'' اور ''سیتا ہرن'' جیسے ناولوں میں موجود ہیں کہ ان میں عورت کے استحصال کی کہانی کو موثر انداز میں دہرایا گیا ہے۔''

(اردو ادب میں تانیثیت، ڈاکٹر مشتاق احمد وانی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2013 ص496)

ناولٹ 'سیتا ہرن' میں سیتا کے کردار کو 'تلسی داس' کے 'رامائن' کے

تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ 'سیتا ہرن' ہندی زبان کا لفظ ہے۔ سیتا، 'شری رام چندر' کی بیوی کا نام ہے۔ 'سیتا'، 'سطر' کے معنی میں آتا ہے۔ 'ہرن'، 'لوٹنا، چرانا، مٹانا یا دور کرنے کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس ناولٹ کے عنوان سے ہی ظاہر ہوتا ہے، سیتا کے ہرن کی کہانی ہے۔ ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے 'سیتا ہرن' کی کہانی کو جاذب، فکر انگیز ناولٹ یا طویل افسانہ کہا ہے۔ ان کی تحریر کے مطابق:

''کتاب کا نام بجائے خود ایک بسیط رمز یا SYMBOL کا کام انجام دیتا ہے۔''

(قرۃ العین حیدر تحریروں کے آئینے میں، اختر سلطانہ، مکتبۂ شعر و حکمت، سوماجی گوڑہ، حیدر آباد، 2005، ص 563)

اس ناولٹ کے تین اہم کردار ہیں۔ سیتا، جمیل اور عرفان۔ سیتا بنیادی طور پر پاکستان کے سندھ سے تعلق رکھنے والی خاتون ہے۔ جو ہجرت کر کے ہندوستان آتی ہے اور پھر حصول تعلیم کے لیے امریکہ جاتی ہے۔ ایک ہندوستانی لڑکی امریکی تہذیب کا دامن پکڑے زندگی بسر کرنے کے خواب دیکھتی ہے اور ناکام ثابت ہوتی ہے۔ سیتا روایتی ہندو گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکن اس میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی پاسداری کا کوئی احساس نظر نہیں آتا ہے۔ وہ ایک مسلمان لڑکے سے شادی کر لیتی ہے اور ایک بچے کی ماں بننے کے بعد بھی غیر مرد کی طرف مائل ہونے لگتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسے اپنے شوہر کے ساتھ وفادار اور مخلص رہنے سے کوئی غرض نہ تھی۔ حالانکہ وہ اپنی غلطی کا خمیازہ بھی بھگتتی ہے۔ اوّل اوّل تو سیتا کے کردار سے الجھن ہوتی ہے، اس کے عمل سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ لیکن سیتا کے کردار میں حسد، جلن یا احساس جرم کی صفت سرے سے ناپید نظر آتی ہے۔ عرفان جب سیتا سے آخری خط میں پوچھتا ہے کہ تمھارے متعلق سنی گئی باتیں کیا سچ ہیں؟ تو وہ بڑی مخلصی سے لکھتی ہے۔ 'میرا انتظار کرو.. میں تمھیں ....اور صرف تمھیں چاہتی ہوں۔ اور انت سمے تک اسی طرح چاہوں گی۔' یہاں سیتا کسی احساس جرم سے اچھوتی نظر آتی ہے۔

افسانہ 'پت جھڑ کی آواز' کی 'تنویر فاطمہ' اور سیتا میر چندانی کے کردار میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ سیتا کی طرح تنویر فاطمہ بھی خوش وقت سنگھ، فاروق اور وقار کے ساتھ غیر ارادی طور پر اپنی زندگی بسر کرتی رہی۔ حالانکہ مردوں کی صحبت سے قبل وہ بگڑی ہوئی تمام لڑکیوں کے متعلق کہتی ہے کہ

''ایک تھیوری تھی کہ وہی لڑکیاں آوارہ ہوتی ہیں جن کا 'آئی۔ کیو' بہت کم ہوتا ہے۔ ذہین انسان کبھی اپنی تباہی کی طرف جان بوجھ کر قدم نہ اٹھائے گا۔ مگر میں نے تو اچھی خاصی سمجھ دار تیز و طرّار لڑکیوں کو لوفری کرتے دیکھا تھا۔ دوسری تھیوری تھی کہ سیر و تفریح، روپیئے پیسے، عیش و آسائش کی رنگی، قیمتی تحائف کا لالچ، رومان کی تلاش، ایڈونچر کی خواہش یا محض اکتاہٹ یا پردے کے قید و بند کے بعد آزادی کی فضا میں داخل ہو کر پرانی اقدار سے بغاوت۔''

(سیتا ہرن، قرۃ العین حیدر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 6-2014، ص 162)

سیتا کی طرح تنویر فاطمہ بھی خود کو ان تمام لڑکیوں میں شمار نہیں کرتی ہے۔ اور وہ اپنے اعمال پر کبھی حیران و پریشان نہیں ہوتی ہے۔ یہ دونوں کردار ہر دفع ایک نئے جوش کے ساتھ ایک نئے شخص کے پاس منھ اُٹھا کے پہنچ جاتے ہیں۔ سیتا اپنے ہمدرد کی باتوں پر بھی کوئی توجہ نہیں دیتی ہے۔ جبکہ تنویر فاطمہ کی نظر میں اس کی سہیلیاں نامناسب معلوم ہوتی ہیں۔ اس کا گمان ان کے متعلق کچھ یوں ہوتا ہے ''پچھل پائیاں، ارے کیا یہ لوگ میری سہیلیاں تھیں؟ عورتیں دراصل ایک دوسرے کے حق میں چڑیلیں ہوتی ہیں۔''

(پت جھڑ کی آواز، قرۃ العین حیدر، مکتبہ جامعہ لمیڈیڈ، نئی دہلی 2011، ص 223-224)

سیتا میر چندانی کے کردار کو اصل 'سیتا' کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے لیکن رام کی سیتا اور جمیل کی ماڈرن سیتا بالکل متضاد ہیں۔ تلسی داس کے 'رامائن' کی سیتا ایک خوبصورت ہرن پر فریفتہ ہو گئیں اور رام سے اس ہرن کی کھال لانے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ یعنی سیتا خوبصورت نظر آنے والے ہرن کے فریب میں آ گئی اور 'راون' کا شکار ہو گئی۔ بیسویں صدی کی سیتا میر چندانی کے لیے کسی ایک راون نے جال نہیں بچھایا بلکہ راون کی شکل میں انٹلیکچوئیل لوگوں کا پورا گروہ موجود تھا۔ جو سیتا کو خوبصورت ہرن کے مانند نظر آتے ہیں۔ بظاہر ان کی خوبیاں سیتا کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہوتی ہیں۔ جبکہ سیتا ان کے متعلق علم رکھتی ہے لیکن پھر بھی نظر کے دھوکے کا شکار ہوتی رہتی ہے۔ اس کے برعکس تنویر فاطمہ بھی دولت مند مردوں کی صحبت سے کوئی گریز نہیں کرتی ہے لیکن مجبوری کے تحت وہ وقار کی بیوی بھی بن جاتی ہے۔ دونوں کردار اپنے معاملات کے متعلق ہوشمند نظر آتے ہیں لیکن جوانی کی خوبصورتی میں بہت مغرور ہو جاتے ہیں۔ تنویر فاطمہ خوشوقت سنگھ سے کہتی ہے ''میں اعلیٰ خاندان سید زادی، بھلا اس کالے تمباکو کے پنڈے ہندو جاٹ سے بیاہ کر کے خاندان کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا لگاتی۔'' (پت جھڑ کی آواز، قرۃ العین حیدر، مکتبہ جامعہ لمیڈیڈ، نئی

دہلی ،2011،ص 216)

قرۃ العین حیدر کے یہاں تہذیبی جدائی پر اثر نظر آتی ہے۔ وہ ایک جگہ اپنے افسانے 'پکچر گیلری' میں کہتی ہیں۔

''ہم جہاں رہتے ہیں، جہاں ہماری جڑیں ہیں۔ ہم دنیا کے کسی حصّے میں بھی چلے جائیں۔ وہ خطّہ جس نے ہمیں جنم دیا ، ہمیشہ ہمارا ذاتی معاملہ رہے گا۔''

(پت جھڑ کی آواز، قرۃ العین حیدر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ،2011، ص 222)

سیتا اور جمیل غیر ملک میں تہذیبی بندشوں سے آزاد کھلے ماحول میں زندگی بسر کرتے ہیں۔

سیتا اور جمیل دونوں اپنی جڑوں سے کٹے ہوئے لوگ تھے۔ جو اپنا گھر غیر ملک میں آباد کرنا چاہتے تھے۔ یعنی تہذیب سے بچھڑے ہوئے لوگ اپنی جڑوں سے کٹ کر غیر ملک میں خود کو محفوظ نہ رکھ سکے۔ انھوں نے اپنے ذاتی معاملات غیر ملک کے سپرد کر دیا اور آخر کار ان کا گھر بکھر گیا۔ سیتا اپنی تہذیب سے بچھڑ گئی۔ ایسا ممکن ہے کہ سیتا اپنی جڑوں سے جدا ہو کر جنسی بے راہ روی کی شکار ہوئی ہو۔

تنویر فاطمہ کے ساتھ اس کے برعکس معاملہ تھا، وہ ہندوستان سے پاکستان ہجرت کر کے گئی تھی۔ ہجرت کی تبدیلیوں نے انسانی ذہنوں کو بھی تبدیل کر کے رکھ دیا تھا۔ تنویر فاطمہ اپنی زندگی کی تبدیلیوں کو بہت شدت سے محسوس کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے

''میں زندگی کی اس یک بیک تبدیلی سے اتنی ہکا بکا تھی کہ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا سے کیا ہو گیا۔ کہاں غیر منقسم ہندوستان کی وہ بھرپور دلچسپ رنگا رنگ دنیا ، کہاں 48 عیسوی کے لاہور کا وہ تنگ و تاریک مکان۔ غریب الوطنی۔''

(پکچر گیلری، قرۃ العین حیدر، عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی 2004، ص 43)

سیتا اور تنویر دونوں ذہین اور سمجھدار خاتون نظر آتی ہیں۔ ان میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت خوب ہوتی ہے لیکن عملاً خود کو ایک حد میں رکھنے سے قاصر ہوتی ہیں۔ سیتا سماجیات کی طالب علم تھی۔ اُسے تاریخی معلومات پر بھی عبور حاصل تھا۔ اس کی ذہانت سے عرفان متاثر ہو کر کہتا ہے کہ

'جمیل غریب بھی دل میں کیا کہتا ہوگا کہ لڑکی کیا پوری لائبریری کی لائبریری سے شادی کی ہے۔'

(سیتا ہرن، قرۃ العین حیدر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی۔20146، ص 70:

اسی طرح تنویر بھی اپنا وقت پڑھائی کے بجائے دیگر کاموں میں صرف کرتی ہے لیکن امتحانات میں بہتر نمبر لاتی ہے۔ یہ دونوں کردار ذہین تو تھے لیکن ان کی ذہانت کا ان کے عمل سے کوئی میل نہیں تھا۔ سیتا جنسی طور پر بہت کمزور نظر آتی ہے۔ اسی طرح تنویر فاطمہ بھی خود کو اس ماحول میں ڈھال لیتی ہے جو دولت مند طبقے کے مشاغل تھے۔ جس طرح دولت مند طبقے میں سماجی قدروں کو نظر انداز کیا جا رہا تھا۔ اسی طرح تنویر بھی اپنے باپ کو جھوٹے خط لکھتی رہی اور ناجائز رشتوں کو اپنے لیے جائز سمجھتی رہی۔ وہ مڈل کلاس کی پابندیوں اور روک ٹوک سے بخوبی واقف تھی۔ جہاں تمام سماجی قدروں کی پاسداری کی جاتی ہے۔ وہ کسی رشتے سے استوار ہوئے بغیر ہی سیر سپاٹوں اور ہیرے جواہرات سے مالا مال ہو گئی تھی۔ وہ اپنی زندگی کے کارناموں کی اصل حقیقت سے ہمیشہ بدگمان رہی۔ زندگی کے آخری حصے میں تنویر کو خود نہیں معلوم تھا کہ اسے کس کا انتظار ہے۔

اس ناولٹ میں سیتا کے مسائل کی مختلف وجوہات نظر آتی ہیں۔ جس میں مشرق و مغرب کی تہذیب، تقسیم ہند، ہجرت اور مہاجر ہونے کا دکھ بھی شامل ہے۔ سیتا ہجرت کے کرب کو شدّت سے محسوس کرتی ہے۔ وہ اور اس کی ماں سندھ کو یاد کرتی ہیں۔ شرنارتھی ہونے کے دکھ نے سیتا کو احساس کمتری میں مبتلا کر دیا۔ وہ قرول باغ کے تنگ و تاریک مکان پر کسی دوست کو لے جانا گوارا نہیں کرتی۔ سیتا کا وجود پاکستان سے ہجرت کر کے ہندوستان میں آباد تو ہو گیا تھا، لیکن وہ عمر بھر اپنا گھر آباد نہ کر سکی۔ سیتا کی زندگی صرف ایک سندھی لڑکی کی داستان نہیں ہے بلکہ ہجرت در ہجرت کے بعد ایک نئے ماحول میں آباد ہونے کا مسئلہ درپیش تھا۔ ایک نئی سوسائٹی، نئے معاشرے کے ساتھ ایڈجسٹمنٹ کا مسئلہ تھا۔

اصل میں سیتا کسی خلش کا شکار نظر آتی ہے جو اس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ انٹلیکچوئیل لوگوں کے قریب جائے۔ انٹلیکچوئیل لوگوں کی صحبت حاصل کرنا سیتا کی کمزوری بن گئی تھی اور وہ اپنی زندگی اسی فریب میں گزارتی چلی گئی۔ سیتا اپنے شوہر کے توسط سے صرف عرفان سے ملتی ہے لیکن اس کی زندگی میں ایک کے بعد دیگر مرد آتے رہے۔ ان مردوں سے یگانگت محسوس کرنے کی کوئی خاص وجہ نظر نہیں آتی ہے سوائے اس کے کہ وہ انٹلکچوئیل ہیں۔ انٹلیکچوئیل لوگوں کا ایک ایسا گروہ بھی موجود تھا جو صرف سیتا کا استعمال کرنے میں دلچسپی رکھتا تھا۔ حالانکہ سیتا اس بات سے واقف ہوتی ہے کہ انٹلکچوئیل لوگ کامیاب ہونے کے لیے دوسروں کی زندگیوں سے کھیل رہے تھے۔ خاص طور سے شادیوں کے معاملے میں میوزکل چیرز کا کھیل کھیل رہے تھے۔ سیتا تعلیم یافتہ اور باشعور خاتون ہونے کے باوجود ان افراد سے دوری اختیار نہیں کر سکی اور نہ ہی کسی مخصوص انسان کے لیے

ایسا جذبۂ محبت پیدا کرسکی کہ جس کے لیے وہ انتظار کر سکے۔ حالانکہ اس کی زندگی میں ایسے مرد بھی آئے، جو اس سے سچّی محبّت کرتے تھے۔ سیتا کے لیے جمیل اور عرفان دونوں وفادار تھے۔ لیکن وہ کسی کی عمر بھر کی ہم سفر نہ بن سکی۔ سیتا، جمیل کے لیے قمر کو نظر انداز نہیں کر سکی اور نہ ہی عرفان کے لیے پروجیش کو درکنار کر سکی۔ سیتا کے عمل کو دیکھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی مرد کے سہارے کی خواہش مند نہیں تھی مگر پھر بھی وہ متواتر مردوں کے رابطے میں رہی۔

آغاز سے لے کر اختتام تک سیتا اور تنویر کے عمل میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی ہے۔ سیتا میر چندانی اور تنویر فاطمہ کا کردار ایسی حسین عورتوں کا ہے، جس پر ہر مرد اپنا دل ہار جاتا ہے۔ سیتا مردوں سے متاثر ہو کر ان کے ہم راہ بھی ہو جاتی ہے۔

اسی سبب سیتا سے جمیل اور عرفان دونوں متنفّر ہو گئے۔ سیتا ہرن اصل میں ایک بے گھر عورت، ایک بیوی، ایک محبوبہ اور ایک ماں کا المیہ نظر آتا ہے۔ سیتا واقعی میں ماں بن گئی تھی لیکن غیر ذمہ دارانہ رویّے کی وجہ سے اسے ماں بننے کا سکھ نہ مل سکا۔ سیتا صرف ایک معشوقہ بن کر رہ گئی۔ جو اپنی تہذیب سے بچھڑ کر خود اپنے لیے ہی منفی ثابت ہوئی۔ انتظار حسین ناولٹ 'سیتا ہرن' کے متعلق لکھتے ہیں:

ہم سیتا جی سے تضاد کی صورت میں پہچانتے ہیں شاید یہ تضاد
وقت کا خمیر ہے ویدک عہد سے صنعتی عہد تک کے سفر کا نتیجہ
ہے یا شاید یوں ہے کہ عورت کی تکمیل مرد سے ہے۔''

(قرۃ العین حیدر تحریروں کے آئینے میں، اختر سلطانہ، مکتبۂ شعر و حکمت، سوماجی گوڑہ، حیدرآباد، 2005، ص 596)

سیتا اور تنویر کے کردار میں ٹھہراؤ بالکل نظر نہیں آتا ہے۔ ان کی زندگیاں مسلسل ایک در سے دوسرے در کا دروازہ کھٹکھٹاتی رہیں۔ سیتا ہرن میں سیتا کے سامنے بظاہر صرف عرفان کا دروازہ بند ہوتا ہے۔ لیکن سیتا کو نہ جانے ابھی کتنے دروازوں پر دستک دینا باقی ہے اور نہ جانے کتنی زندگیوں کا حصّہ بننا باقی ہے۔ سیتا اور تنویر جنسی بے راہ روی کی شکار نظر آتی ہیں لیکن اصل میں یہ دونوں خود فریبی میں مبتلا ہوتی ہیں۔ سیتا جمیل یا عرفان کو فریب نہیں دے رہی تھی بلکہ وہ ساری زندگی خود کو فریب دیتی رہی۔ اسی طرح تنویر اپنے باپ کو فریب نہیں دے رہی تھی بلکہ خود کو فریب دے رہی تھی۔

مختصر طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ بیسویں صدی یا اکیسویں صدی میں دنیا کتنی بھی ترقی یافتہ ہو جائے مگر رشتے اپنی وقعت تبھی باقی رکھتے ہیں جب وہ اپنی حدوں میں رہتے ہیں۔ کسی بھی ملک یا مذہب میں شادی کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔ سیتا نے ان اصولوں کا پاس نہیں رکھا انھیں فراموش کر دیا۔ اصل میں ''سیتا ہرن'' خود فریبی میں کی گئی رشتوں کی ناقدری کا المیہ معلوم ہوتا ہے۔ تنویر فاطمہ شادی کیے بغیر ہی مردوں کے ساتھ زندگی بسر کرتی رہی اور شادی جیسے رشتے کو غیر معنی بنا دیا۔ حالانکہ وہ تعلیمی میدان میں بہت قابل ثابت ہوئی کہ اسے عمر بھر اسکولوں اور کالجوں سے آفر آتے رہے۔ لیکن پہلے وہ دولت مند مردوں اور پھر مردوں کے چکر میں زندگی کو ایک ایسی راہ پر لے جاتی رہی جو اس کی منزل نہیں تھی۔ وہ عمر بھر بے راہ روی کا شکار رہی۔ وہ اپنے متعلق کہتی ہے

''میری حیثیت کوئی قابل ذکر نہیں گمنام ہستی ہوں۔ اس لیے
کسی کو میری پروا نہیں۔ خود مجھے بھی اپنی پروا نہیں۔''

(پت جھڑ کی آواز، قرۃ العین حیدر، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی، 2011، ص 216،217)

ترقی یافتہ سماج میں جہاں زندگیاں آسان ہو رہی ہیں وہیں نئے مسائل بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ سیتا نے اپنی ازدواجی زندگی کے شروعاتی دنوں میں ہی غیر مردوں کی وجہ سے اپنا گھر برباد کر لیا اور پھر عمر بھر آباد نہ ہو سکی۔ سیتا وقت کے اس عظیم دھارے میں بہہ گئی اور ساحل کی تلاش میں عمر بھر بھٹکتی رہی۔

''انسان وقت اور واقعات کے دھارے میں بہتا چلا جاتا
ہے اور اسے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کیا ہونے والا ہے۔''

(سیتا ہرن، قرۃ العین حیدر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ 20146، ص: 68)

سیتا بھی وقت کے دھارے میں بہتی چلی گئی۔ کب، کہاں اور کیسے حادثات اس کی زندگی میں ہوتے چلے گئے اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ اس کا ہاتھ اب خالی رہ گیا۔ تنویر نے پہلے اپنی زندگی کے بہترین وقت کو مردوں کے لیے ضائع کر دیا اور پھر آگے کے وقت میں اس کی ناقدری ہوتی رہی۔ وہ عمر بھر ایک گمنام زندگی بسر کرتی رہی۔ سیتا اور تنویر اپنی زندگی میں تمام مسائل خود ہی پیدا کرتی رہی اور ان مسائل کا حل غیر مردوں کی پہلوؤں میں تلاش کرتی رہیں اور آخر کار سیتا تنہا ہی رہ گئی اور تنویر کی زندگی میں از خود رفتہ ایک مرد پھر شامل ہو گیا۔

□□□

Saima
Research Scholar
Dept. of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh-202001 (U.P)

مہر فاطمہ

کلاسیکی اردو شاعری میں رقیب کا کردار

یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ دنیا کی تمام زبانوں کے شعری سرمایہ میں عشقیہ ادب زیادہ مشہور ومقبول رہا ہے۔ فارسی اور اردو شاعری سے اگر یہ نکال دیا جائے تو بے جان اور بے کیف ہوجائے گی۔ اردو شاعری میں امیر خسرو سے لے کر آج تک شاعری کا اہم موضوع عشق ہی رہا ہے۔ اردو شعرا نے عشق کے موضوع کو تمام موضوعات پر فوقیت دی۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ دوسرے موضوعات بالکل رد کردیے گئے بلکہ سماجی اور سیاسی موضوعات بھی اگر غزل کی حدود میں داخل ہوئے تو عشق کا رنگ اختیار کر گئے۔ مثال کے طور پر سراج الدولہ کی گرفتاری ایک سیاسی سانحہ تھی۔ مگر جب غزل کا شاعر اسی سانحہ سے متاثر ہوا تو اس نے اس طرح کہا:

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

اس طرح کے لاتعداد اشعار ہیں جو غزل کے انداز میں رچ بس کر اردو کے شعری ادب کی جان بن چکے ہیں۔ لہٰذا صنف غزل میں جن انفرادی کیفیات کی تصویر کشی ملتی ہے اس میں عشقیہ کیفیات بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ غزل نے متنوع اور رنگا رنگ عشقیہ کیفیات کو اپنے دامن میں جگہ دی اور ان جذباتی تقاضوں کو پورا کیا۔ ان عشقیہ کیفیات میں آفاقیت ہے۔ خسرو، ولی، سودا، درد، مصحفی، غالب اور مومن نے جن عشقیہ کیفیات کو پیش کیا وہ آج بھی ہمیں اپنی کیفیات معلوم ہوتی ہیں:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اب رہی بات کہ شاعروں نے اپنے اپنے زمانوں میں جن عشقیہ کیفیات کی ترجمانی کی ہے ان میں کہیں یکسانیت یا یک رنگی کی کیفیت نہیں بلکہ ہر ایک میں انفرادی خصوصیت اور امتیازی رنگ نمایاں ہے۔ ہر ایک کا رنگ بالکل منفرد اور علیحدہ ہے اور الگ پہچانا جاسکتا ہے۔ اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے محمد حسن ''اردو میں عشقیہ شاعری'' میں لکھتے ہیں:

> اردو شاعری میں عشق کا تصور ہر شاعر کے یہاں مختلف ہے اور جدا انداز لیے ہوئے ہے۔ گو ہر شاعر حسن، محبوب، عشق و عاشقی، وصال اور فراق ہی کی باتیں کرتا ہے۔ مگر شاعر کے اپنے تصورات کی بنا پر معانی اور مفاہیم بدلتے چلے جاتے ہیں۔ غالب نے اسی بات کو مدنظر رکھ کر یہ کہا ہے:
>
> ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
> بنتی نہیں ہے بادہ وساغر کہے بغیر

(اردو میں عشقیہ شاعری، ص13)

غزل کی روایت میں گل وبلبل، شمع وپروانہ، مے ومیخانہ، گل چیں وباغباں، گلشن وصحرا، قیس ولیلیٰ، فرہاد وشیریں، یوسف وزلیخا اور طور وموسیٰ وغیرہ نہ جانے کتنے اشاروں، تمثیلوں اور تلمیحوں کا استعمال ملتا ہے۔ ہر شاعر اپنے اپنے انداز میں ان کا استعمال کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی انفرادی خصوصیت علاحدہ نظر آتی ہے۔ اس میں شاعر کی شخصیت کا بھی دخل ہوتا ہے اور شخصیت بڑی حد تک ماحول کے اثر سے بنتی ہے۔ ہر دور کا ماحول دوسرے دور کے ماحول سے کسی نہ کسی حد تک مختلف ہوتا ہے اور اس ماحول کے اثرات شاعر کی شخصیت پر مختلف زاویوں سے پڑتے ہیں۔ شاعر کا فن اس شخصیت کا عکس ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ غزل کے ہر دور میں بلکہ ایک ہی

دور کے مختلف غزل گوشعرا میں اس رنگا رنگی کا احساس ہوتا ہے۔صرف میر اور غالب ہی ایک دوسرے سے مختلف نہیں، بلکہ خود میر، سودا اور درد میں باوجود ایک ہی عہد میں پیدا ہونے کے بالکل مختلف ہیں۔مثلاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ میر کے یہاں محبت سپردگی، ناکامی، اداسی اور سوگواری کا نام ہے۔ کیونکہ حالات نے ان پر کچھ اسی طرح کے اثرات چھوڑے۔سودا کے یہاں وہ کسی حد تک بدل جاتا ہے۔یہاں سوگواری اور اداسی کی جگہ مسرت وشادمانی ملتی ہے۔درد کے یہاں حقیقت و معرفت کی چاشنی نمایاں ہے۔ بالکل یہی معاملہ مصحفی، انشا اور جرأت کے یہاں بھی ہے۔تینوں ایک ہی عہد سے تعلق رکھتے ہیں لیکن بالکل مختلف رنگ کے حامل ہیں۔ مصحفی کے یہاں عشق سوز و گداز کا نام ہے۔ جرأت کے یہاں وہ معاملہ بندی سے عبارت ہے۔انشا کے یہاں محض خوش وقتی اور شوخی ہے۔جیسا کہ ماقبل بھی ذکر آیا کہ کلاسیکی اردو غزل میں عشق کے مضامین کو مرکزیت حاصل ہے البتہ دیگر مضامین پر بھی پابندی نہیں اور تمام عشقیہ شاعری کل تین مرکزی کرداروں پر قائم ہے:

(۱) عاشق

(۲) معشوق

(۳) رقیب

غزل میں چونکہ ذاتی یا انفرادی عشق کا بیان نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ غزل کا عاشق تمام عاشقوں کا نمائندہ ہے، کوئی ایک شخص نہیں ہے۔ یہ عاشق معشوق کے لیے بے قرار ہے۔لیکن معشوق کو حاصل کرنے میں ناکام ہے۔وہ تقدیر کا پابند ہے۔ہجر اس کا مقدر ہے۔اور یہ بات بھی اہم ہے کہ ہجر اور حرماں نصیبی کو غزل کی شعریات میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ محبوب سے محبت، اس کی جدائی کا کرب، محبوب کے کھو دینے کا غم زندگی کا وبال بن جاتا ہے۔ یہی کیفیت تقریباً تمام شعرا کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہے۔یعنی عشق کے بیان میں دو اہم موضوعات وصل و ہجر ہیں۔

عاشق معشوق سے وصل کی خواہش کرتا ہے۔وصل کی تمنا میں ہی نئے نئے پہلو کو اشعار کے قالب میں ڈھالتا ہے اور ہجر کی کیفیات کو اپنے تخیل کی مدد سے اشعار میں جگہ دیتا ہے۔چونکہ غزل کا معشوق بھی ایک فرد نہیں ہے بلکہ تمام معشوقوں کا نمائندہ ہے اسی لیے سب سے زیادہ حسین ہے اور جتنا حسین ہے اتنا ہی ظالم و جابر ہے۔سنگدلی معشوق کی علامت ہے۔

رقیب کا کردار بھی غزل کا ذیلی کردار ہونے کے باوجود وسعت لیے ہوئے ہے۔کیونکہ یہ اغیار ناصح، محتسب اور حاکم سے لے کر تمام مخالفین بلکہ پوری دنیا اس احاطے میں آجاتی ہے۔عشق کے بیان میں عاشق، معشوق، وصل و ہجر، محبوب کی سنگدلی، محبوب کے حسن، رقیب، محتسب، ناصح اور زاہد وغیرہ کے مضامین نظم کیے جاتے ہیں۔

اردو غزل کے حسن و عشق کے باب میں اور سب سے اہم کردار رقیب کا ہے۔ یہ کردار بڑی وسعت کا حامل ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے احاطے میں اغیار، ناصح، محتسب اور حاکم سے لے کر تمام مخالفین، بلکہ پوری دنیا اس میں شامل ہے۔ یہ موضوع ہر شاعر کے یہاں موجود ہے۔قنوطی سے قنوطی شاعر بھی اس سے اپنا دامن نہیں بچا سکتا اور یہ مضامین غزل میں عجیب بھی نہیں معلوم ہوتے کیونکہ غزل رندوں کی صنف سخن ہونے کی وجہ سے خود اپنے مزاج میں بھی ایک رندی کی کیفیت رکھتی ہے۔غزل کی اسی رند مزاجی نے ان موضوعات کو غزل کے لیے مناسب بنا دیا اور وقت کے ساتھ ساتھ وہ اس کی شعریات کا حصہ بن گئے۔غزل میں ان موضوعات کا محرک وہی عشقیہ ماحول ہے جس سے غزل عبارت ہے اس عشقیہ ماحول نے غزل کو عقل و شعور کے بجائے جذبات واحساسات کا ترجمان بنایا ہے۔اسی لیے غزل میں عقل سے زیادہ جذبات کی باتیں ہوتی ہیں۔جنون اور دیوانگی کا تذکرہ ہوتا ہے۔غرضیکہ غزل کی مجموعی فضا صرف ایک چیز سے وابستگی کے خیال کو عام کرتی ہے اور یہ خیال ہے عشق اور معاملات عشق سے دلچسپی اور ان معاملات سے یہ دلچسپی اس قدر بڑھتی ہے کہ اگر کوئی اس راہ میں حائل ہو تو غزل کی فضا اس کو برداشت نہیں کر سکتی۔اس صورت میں وہ افراد جو عقل کا درس دیتے ہیں اور عشق و معاملاتِ عشق کی مذمت کرتے ہیں، اس راہ پر چلنے والوں کو روکنا چاہتے ہیں غزل میں ان کا مذاق اڑایا جاتا ہے ان پر پھبتیاں کسی جاتی ہیں۔غزل میں یہ افراد ناصح اور واعظ کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ناصح اور واعظ عشق اور معاملات عشق کی مذمت کرتا ہے۔عاشق کو ناصح کی نصیحت آمیز باتیں بالکل نہیں بھاتیں۔ چنانچہ ناصح اور واعظ کا مذاق اڑانا اور ان کو رسوا کرنا عاشق کا شیوہ ہے۔ ایسے مواقع پر غزل میں شگفتگی اور شوخی کا ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔کلاسیکی اردو شاعری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہم اس سے سیکھ سکتے ہیں کہ طنز و مزاح کو نہایت لطیف اور مہذب پیرایے کے وسیلے سے ادب عالیہ کا حصہ کیونکر اور کیسے بنایا جا سکتا ہے۔اردو کے قدیم اساتذہ شعر کو روایت کے طور پر فارسی کے نمائندہ شعرا مثلاً حافظ، انوری یا سعدی کے شعری نمونے ملے تھے۔اس روایت میں طنز و مزاح کے اچھے نمونے بھی موجود تھے مثلاً:

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چوں بخلوت می روند آں کارے دیگر می کنند

یا:

اے کبک خوش خرام کجا می روی بایست
غرہ مشو کہ گربہ زاھد نماز کرد

لہٰذا اس پس منظر میں ہمیں اپنے کلاسیکی شاعروں کا لب ولہجہ بہت چونکا دینے والا تو نہیں لگتا ہے لیکن بات سے بات نکالنے کا فن اور ایک مضمون کو سورنگ سے باندھنے کا ہنر ان کی مشاقی اور مہارت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔اس موضوع سے متعلق ابتدا سے آج تک عمدہ سے عمدہ اشعار غزل کے مختلف شاعروں کے یہاں ملتے ہیں۔مثلاً:

میر:

عام حکم شراب کرتا ہوں
محتسب کو کباب کرتا ہوں

یوں بھی سر چڑھتا ہے اے ناصح کوئی مجھ سے کہ ہائے
ایسے دیوانے کو سمجھاتے ہیں سمجھانے کی طرح

غالب:

حضرت ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی
کہاں میخانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

مومن:

ذکر اغیار سے ہوا معلوم
حرف ناصح برا نہیں ہوتا

شرم کی بات نہیں ہے یہ اثر ہو کیونکر
نہ میں مومن ہوں نہ تو پیر مغاں اے واعظ

داغ:

اگرچہ بادہ کشی تھی گناہ اے زاہد
جو تجھ سے چھین کے پیتا تو کچھ عذاب نہ تھا

ناصح کا جی چلا تھا ہماری طرح مگر
الفت کی دیکھ دیکھ کے رفتار رہ گئے

ترا پیرہن میری باتوں سے ناصح
مرا ہی گریباں ہوا چاہتا ہے

امیر مینائی:

باتیں ناصح کی سنیں یار کے نظارے کیے
آنکھیں جنت میں رہیں کان جہنم میں رہے

جگر:

ناصح کم نگاہ سے کون یہ کہہ کے سر کھپائے
راز شگفتگی سمجھ، رنگ شگفتگی نہ دیکھ

واعظ نہ ڈرا مجھ کو قیامت کی سحر سے
دیکھی ہے ان آنکھوں نے قیامت کی سحر بھی

اصغر:

زاہد نے مرا حاصل ایماں نہیں دیکھا
رخ پر تری زلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا

یہ خانقاہ نہیں پی جا ارے زاہد
یہ مے کدہ ہے یہاں احتراز رہنے دے

نیاز عشق کو سمجھا ہے کیا اے واعظ ناداں
ہزاروں بن گئے کعبے جبیں میں نے جہاں رکھ دی

یہ اشعار عشقیہ پس منظر رکھتے ہیں۔ان کا محرک ایک عشقیہ ماحول ہی ہے۔اس لیے یہ موضوعات غزل کی عام فضا سے نامانوس نہیں۔ان کو اس فضا سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔یہی وجہ ہے کہ یہ موضوعات غزل کی روایت کا ایک لازمی جزو بن گئے ہیں اور حسن وعشق کے باب میں ان کی اہمیت کم نہیں۔بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ یہ موضوعات غزل کی عشقیہ روایت کا ایک اہم حصہ ہیں۔یہ عشقیہ فضا میں اور شدت پیدا کرتے ہیں اور ان کے باعث عشقیہ اقدار میں استواری اور ہمہ گیری پیدا ہوتی ہے۔غزل کی اسی رندانہ کیفیت نے تصوراتی اعتبار سے مذہب سے برگشتگی کے خیال کو عام کیا اور ایسے افراد کو آڑے ہاتھوں لیا جو اس فضا کو پیدا کر رہے تھے۔تصوف نے اس میں کچھ اور شدت پیدا کی۔کیونکہ تصوف میں ایسے لوگوں کے لیے بالکل جگہ نہیں ہے جو سر گشتۂ رسوم وقیود ہوں۔جن کے پاس مذہب کی آڑ ہو،غزل نے ایسے افراد کے ''کارِ دیگر'' کو اچھی طرح بے نقاب کیا۔شیخ اور زاہد وغیرہ ایسے ہی افراد کی علامتیں ہیں۔غزل کا ایک

خاصا حصہ اسی موضوع کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی پر مشتمل ہے۔

یہ اشعار اس فضا کو پوری طرح پیش کردیتے ہیں جو غزل میں شیخ، زاہد اور واعظ سے متعلق معاملات کی ترجمانی سے پیدا ہوتی ہے۔ ان کو پیش کرنے کے انداز میں ایک شوخی اور شگفتگی کو دخل ہے، لیکن یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ صرف تفنن طبع کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ ان کے پیچھے بھی زندگی کے بعض گہرے حقائق ہیں۔ غزل ان حقائق کو پیش کرنے میں پیش پیش رہی ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ غزل اس شوخی اور شگفتگی کو پیدا کرنے میں کچھ حدود سے باہر بھی گئی، لیکن انتہا پسندی کے ساتھ ساتھ اس میں ایک بانکپن بھی ہے۔ ایک سوچ اور لچک کی کیفیت ضرور پیدا ہوگئی ہے۔ اس نے غزل سے قنوطیت کی فضا میں بڑی حد تک اجالا کر دیا۔ اس کے ذریعے غزل میں تنوع پیدا ہوا۔ اردو غزل طنز ومزاح اور شوخ وشگفتگی سے آشنا ہوئی اور اس میں تنوع اور وسعت پیدا ہوئی۔ اس طرح حسن وعشق کے باب میں تین اہم کردار عاشق، معشوق اور رقیب کے متعلق مضامین ہیں اور معشوق کے ہجر ووصال کی داستان ہے۔ رقیب کو بھی کھری کھوٹی سنائی گئی ہے تو وہیں شیخ زاہد اور ناصح پر بھی پھبتی کسی گئی ہے۔ اس باب میں کہیں سوز وگداز ہے تو کہیں طنز ومزاح۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ دیکھنے سے تو یہ صرف ایک موضوع ہے لیکن اس میں کتنے مضامین ہیں شعرا کا تخیل کہاں کہاں جا پہنچتا ہے۔ کس کس طرح بات سے بات نکلتی ہے۔ اسے دیکھ کر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ عشق کا موضوع خود ایک بحر بے کراں ہے جس کی وسعت کا اندازہ ناممکن ہے۔

□□□

Mehar Fatima
#C206, Saranya Sarovar Spartment,
Hugdur Main Road,
Whitefield
Bangalore-560066 Karnataka

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا / چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ / منی آرڈر................................ بتاریخ..

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے 90092010045326 :IFSC:CNRB0019009، A/C

میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail:magazines@ncpul.in

دستخط

روحی جان

ادب اور صحافت پر ایک طائرانہ نظر

صحافت از سفارش ہے
صحافت داد نوازش ہے
تمھیں پالا ہے نازوں سے
ملایا جاں بازوں سے
نیا دور آیا ہے جب سے
نکالا گیا ہوں اصناف ادب سے

ادب اور صحافت کے بارے میں جتنے بھی نظریات منظر عام پر آتے رہے ہیں، انھیں دو زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک گروہ وہ ہے جو ادب اور صحافت کے باہمی تعلق کو اجاگر کرنے کی کامیاب کوششیں کر رہے ہیں اور دوسرا جو صحافت کو ادب کے زمرے میں شامل ہی نہیں کرتے۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ صحافت محض ابلاغ ہے جو عام و سادہ تحریر کے ذریعے لوگوں تک پہنچایا جاتا ہے۔ ایسی تحریروں کی زندگی پیدا ہوتے ہی مر جاتی ہے۔ جب کہ ادب مقفیٰ و مسجع ہوتا ہے جس کے ذریعے سے ادیب مختلف جذبات و خیالات کو اپنے خاص نفسیاتی اور شخصیاتی خصائص نہ صرف ظاہر کرتا ہے، بلکہ عمدہ تراکیب، تشبہات و استعاراتی یعنی مختلف صنعتوں کا استعمال کر کے زندگی کے مختلف طبقوں کی ترجمانی کرتا ہے اور ان تحریروں کی زندگی ابدی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا ادب اور صحافت کے بارے میں یوں لکھتے ہیں۔

''ادب کی حیثیت مستقل ہے اور صحافت کی حیثیت ہنگامی، لیکن ادب اور صحافت کا فرق مواد اور موضوع تک ہی محدود نہیں دراصل اس کا نمایاں مظہر وہ طریقہ اظہار ہے جو ادب کو ادب اور صحافت کو صحافت کا درجہ عطا کرتا ہے۔''

(ڈاکٹر وزیر آغا، مشمولہ پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ (ابتدا تا 1988) اکادمی ادبیات، اسلام آباد، پاکستان)

دوسری جگہ یوں لکھتے ہیں:

''ادب بنیادی طور پر ادیب کے اظہار ذات کی ایک صورت ہے اور یہ بنیادی طور پر ادیب کے اظہار باطن کا وہ نغمہ ہے جو مزاجاً اشارے، کنائے، استعارات اور تمثیلات کی اساس پر قائم ہے اور جذبے کی تہذیب کر کے قاری کو جمالیاتی خط بہم پہنچاتا ہے اور ادب میں خارجی حقیقت ایک عجیب سی خوابناک اور سحر انگیز کیفیت میں ڈھل جاتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس صحافت خارجی حقائق کو براہ راست پیش کرتی ہے اور اس کا فہم و شعور کی مدد سے حقائق کو اور واقعات کا تجربہ اور ادراک ہے۔''

(ڈاکٹر جاوید حیات، مبادیات صحافت، مکتبہ آزاد پنولین گلزار باغ پٹنہ بہار، 1995، ص 72)

لیکن ادب محض ادیب کے ذاتی اظہار کا نام نہیں اور نہ ہی ادب کا مقصد محض قاری کو ذاتی خوشی و تفریح طبع اور جمالیاتی حظ بہم پہنچانا ہے۔ کوئی بھی ادیب صحیح معنوں میں ادیب ہو ہی نہیں سکتا جب تک وہ اپنے زمانے کے حالات و واقعات سے بے نیاز ہو۔ ادب نہ صرف ہمارے دوسرے اعمال و افعال کی طرح زندگی کے معاشی و اقتصادی اور سماجی پہلو سے براہ راست متاثر ہوتا ہے بلکہ انسانی زندگی، سماج اور معاشرے کی تمام ناگوار،

تلخ وشیریں کیفیات کا اظہار ہے اس لیے جیسا معاشرہ ہوگا ویسا ہی ادب تخلیق ہوگا۔ عابد صدیقی اس حوالے سے متعلق یوں رقمطراز ہیں۔

”ادب کا مقصد زندگی کی تہذیب وتعمیر ہے ادب نے ہمیشہ انسان کو ذہنی روحانی مسرت اور تفریح کے سامان ہی فراہم نہیں کیے بلکہ زندگی کو برتنے کا سلیقہ سکھایا ہے۔ ادبی تاریخ شاہد ہے کہ ادب سے ہر دور میں مختلف انداز سے کام لیے گئے ہیں۔ فرانس میں روسو کی ادبی تحریریں، انقلاب فرانس کا محرک رہیں اسی طرح ہندوستان کی آزادی میں الہلال و البلاغ اور دیگر بے شمار تحریریں انگریزوں کے خلاف بر پور وار کی حیثیت رکھتی تھیں۔ سر سید نے ادب سے سماجی و مذہبی اصلاح کے کام لیے ادب کو تبلیغ کا ذریعہ بنایا گیا۔ نظریات کی تشہیر کے لیے ادب ہی کو واسطہ کی حیثیت حاصل رہی غرض ادب زندگی کا آئینہ دار بن کر ہر دور میں اپنے مقاصد کی ترجمانی کرتا رہا اس لحاظ سے ادب کے مقاصد محدود کرنا یا ان کا تعین کرنا مشکل ہوتا ہے۔“

(عابد صدیقی، ادب اور صحافت، نیرنگ اکیڈمی، حیدرآباد 1974، ص76)

گو کہ ادب کا مقصد صرف ذاتی خوشی یا تفریح طبع نہیں بلکہ معاشرے کو اخلاقی اقدار کا پابند بنانا بھی ادب کا مقصد ہے اور ایسے ادیبوں کی لمبی فہرست ہے جن کا میلان معاشرے کو مثالی بنانے کی طرف ہے۔ علامہ اقبال اس بارے میں یوں کہتے ہیں ”شاعر رنگین نوا ہے دیدہ بینائے قوم“ اسی طرح ناقدین ادب، ادب کو سماج کا آئینہ سمجھنے کے قائل ہیں جیسے ”کامیاب ترین ادب وہ ہے جو ماحول کا آئینہ بھی ہو اور مستقبل کا اشاریہ بھی۔“ یوں جب ہم صحافیانہ تخلیقات پر تنقیدی نگاہ ڈالتے ہیں تو ہم اس حقیقت سے بھی آشنا ہوتے ہیں کہ صحافت محض خبر ہی نہیں ہے بلکہ خبروں کی بنیاد پر جب کالم، اداریہ، فیچر، تبصرہ، تجزیہ اور دیگر مضامین وغیرہ جیسی تحریریں لکھی جاتی ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نہ صحافت کو ادب کے زمرے سے الگ کیا جاسکتا ہے نہ اخبارات میں شائع ہونے والی تمام تحریریں وقتی ہوتی ہیں۔ نیز صحافت کو جلد بازی میں لکھا جانے والا ادب کہا جاتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ جلد بازی میں لکھی جانے والی تحریریں ادبی اہمیت کی حامل نہیں ہوتیں۔ دنیائے ادب بلکہ خود اردو ادب میں ایسے کئی ادباء، شعرا اور زود نویس گزرے ہیں جنھوں نے ایک نشست میں پوری نظم، پورے افسانے لکھ ڈالے اور آج بھی ان کی اہمیت مسلم ہے۔ رشید حسن خاں اس حوالے سے یوں لکھتے ہیں:

”خبریں کیسی ہی ہوں وہ خبریں ہوتی ہیں اور خبریں رہتی ہیں۔ جب ان خبروں کی بنیاد پر کچھ اور لکھا جاتا ہے، وہ ایڈیٹوریل نوٹ ہو، کوئی افسانہ ہو یا ڈراما، تب ادب اور صحافت کی بحث شروع ہوتی ہے۔“

(اردو صحافت، مرتب: انور علی دہلوی، مضمون: ادب اور صحافت از رشید حسن خاں، اردو اکادمی دہلی 2009، ص261)

لیکن ان میں زیادہ تر تخلیقات وقت کے ساتھ ساتھ اپنی اہمیت و وقعت کھو دیتی ہیں اور کچھ ہی تحریریں بقائے دوام کی حامل ہوتی ہیں یعنی ادبی اعتبار سے ان کی اہمیت تسلیم کی جاتی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ صحافتی تحریر کو ساحل سمندر پر کھینچی ہوئی لکیر کہا جاتا تھا اور ایک زمانہ یہ ہے کہ صحافتی تحریریں بہتے دریا کی لہروں پر کھینچی ہوئی لکیر بن کر رہ گئی ہیں یعنی یہ تحریریں پیدا ہوتے ہی مر جاتی ہیں۔ اس پر غور کرنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ سارا معاملہ صحافتی تحریروں کا معیار ہے۔ کیونکہ ایسی تحریریں صحافت کی بنیادی خوبیوں سے محروم ہوتی ہیں جیسے معلومات، اسلوب، لکھنے والے کی طرز فکر و طرز تحریر اور تناظر جیسی خوبیوں سے محروم ہوتی ہیں۔ اس سے متعلق رشید حسن خاں کے خیالات نہایت ہی مفکرانہ ہیں وہ یوں لکھتے ہیں:

”اس ساری بحث سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اصل چیز لکھنے والے کا طرز عمل ہے، اس انداز فکر اور انداز نظر سے بہت اچھے صحافی کی تحریر ادبی ہوسکتی ہے اور بہت اچھے ادیب کی تحریر صحافیانہ ہوسکتی ہے۔“

(اردو صحافت، مرتب: انور علی دہلوی، مضمون: ادب اور صحافت از رشید حسن خاں، اردو اکادمی دہلی 2009، ص265)

ادبی اور صحافیانہ نقطہ نظر کی بنیاد پر جب ہم اردو ادب کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ایک اچھے ادیب کی تحریر صحافیانہ اور ایک اچھے صحافی کی تحریر ادبی ہوسکتی ہے اور ایسے صحافیوں اور ادیبوں کی ایک لمبی فہرست ملے گی جیسے محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد، عبدالماجد دریا آبادی، ابوالاعلیٰ مودودی، نیاز فتحپوری، چراغ حسن حسرت، خواجہ حسن نظامی، حیات اللہ انصاری، ابواللیث اصلاحی وغیرہ حضرات بیک وقت اعلیٰ درجے کے ادیب اور صحافی بھی تھے اور ایسے صحافیوں کی کمی بھی نہیں جو صرف صحافی تھے لیکن ان کی تحریروں میں فکر کی گہرائی اور ادبی چاشنی اس درجہ ہے کہ انھیں بقائے دوام حاصل ہوا۔ مذکورہ گفتگو سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ صحافت ادب ہی کی قسم ہے چونکہ دونوں کا تعلق انسانی زندگی اور معاشرے سے مربوط ہے صحافت میں واقعات کی عکاسی کی جاتی ہے اور ادب ان واقعات کی

تشریح اوران کا تجزیہ کرتا ہے دونوں میں انسانی معاشرہ، روزمرہ کے حالات وواقعات کوموضوع بحث بنایا جاتا ہے۔دونوں کا سلسلہ نسب تاریخ وروایتی اعتبار سے یکساں ہے دونوں زبان کے پروردہ ہیں۔ صحافت میں جامعیت اور اختصار کا ہونا اسے غزل اورخاکہ سے مماثل کرتا ہے اورزبان کا سادہ، آسان اورعام فہم اورمبالغہ سے پاک ہونا سرسید وحالی کی نثر سے جاملاتا ہے۔ادب اور صحافت کے باہمی رشتے کے بارے میں ڈاکٹرفوزیہ چودھری یوں رقمطراز ہیں:

ادب اورصحافت لازم وملزوم ہیں ان کوقطعی طورایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا گویا ان کی حیثیت پانی ملے ایسے دودھ کی ہے جس سے ادب کا دودھ اورصحافت کا پانی الگ نہیں ہوسکتے البتہ یہ ممکن ہے کہ اکثر اوقات ہم دودھ کوالگ خالص حالت میں استعمال کریں اور پانی سے الگ فیض یاب ہوں۔

(اردو کی مزاحیہ صحافت :فوزیہ چودھری، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، 2000، ص41)

اس طرح ادب اور صحافت کا آپس میں گہرا رشتہ پایا جاتا ہے دونوں کا تعلق زبان سے ہے، صحافی اور ادیب دونوں اپنے جذبات و احساسات یا واقعات کا اظہار کرنے کے لیے زبان کا سہارا لیتے ہیں۔ دونوں الفاظ کے جادوگر ہوتے ہیں۔جس طرح ادب میں ذہن وفکر کے علاوہ جذبات واحساسات کی ترجمانی ہوتی ہے اسی طرح صحافت کا بھی انسانی جذبات واحساسات سے گہرا تعلق ہے اور حقیقت میں الفاظ خیالات کی پوشاک ہیں۔ اس کے بغیر نہ اچھے ادب کی تخلیق ہوسکتی ہے اور نہ ہی خبروں کی تشکیل۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایسے تمام واقع جو عام زندگی اور سیاست سے وابستہ ہیں اس کی اطلاع اور فراہمی خبر تو ہے لیکن اسے جوں کا توں پیش نہیں کیا جاتا بلکہ انھیں ضبط تحریر میں لاتے وقت ایک صحافی اس خبر کوپُراثر وپرُتاثیر بنانے، جملوں کی درستگی، زبان وبیان کے لحاظ سے بہتر و دلکش اسلوب برتنے کے لیے اپنی تمام کوششیں بروئے کار لاتا ہے اور بہترین سرخی تیار کرتا ہے گویا وہ صحافت کوادب جیسا چمکاتا ہے یعنی صحافی جو اسلوب استعمال کرتا ہے وہ ادب سے بہت قریب ہوتا ہے۔اس حوالے سے ڈاکٹرمسکین حجازی یوں لکھتے ہیں۔

"اعلیٰ پائے کے ادب اوراعلیٰ پائے کی صحافت میں کوئی فرق نہیں ہے۔دونوں میں ہمیشہ برقرار رہنے والی قدریں موجود ہیں۔دونوں کے محرک احساسات، جذبات اور مشاہدات ہیں۔صحافت معاشرے اورزمانے کی عکاسی کرتی ہے اورکسی دور کی صحافت اس دور کی تاریخ بھی کہلاتی ہے۔ بلند پایہ ادب کی بھی یہی خوبی ہے۔مقاصد کے لحاظ سے صحافت اور ادب میں وسیع اشتراک پایا جاتا ہے۔ دونوں بلند انسانی اقدار کا فروغ چاہتے ہیں۔ دونوں معاشرے اور حالات میں مخصوص مثبت تبدیلیاں لانا چاہتے ہیں۔ ظلم وزیاتی، ناانصافی اوراستحصال کے خاتمے کے لیے دونوں کوشاں رہتے ہیں نیز کسی حدتک دونوں کی پیش کش کے ذرائع بھی ملتے جلتے ہیں۔"

(ڈاکٹرمسکین علی حجازی :صحافتی زبان، سنگ میل پبلیکیشنز لاہور، 1987، ص7)

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ صحافت اورادب بعض امور میں مختلف ہی سہی لیکن متضاد نہیں ہے۔جس طرح ادب کی باقی اصناف کے اپنے الگ الگ اصول وضوابط ہیں اسی طرح صحافت کے بھی اپنے اصول وضوابط ہیں۔ بہرحال صحافت اورادب کا رشتہ جیسا بھی ہولیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ صحافت ادب ہی کا حصہ ہے۔ڈاکٹر صالح عبداللہ جنھوں نے صحافت پراچھاخاصا کام کیا ہے وہ صحافت کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

"ادبی نثر کی بھی دو قسمیں ہیں (1) سادہ ادبی نثر: اس میں تنقید، تحقیق، تجزیہ، خاکہ، مکاتیب انشائیے اور صحافیانہ تحریریں سب شامل ہیں۔ (2) ادبی تخلیقی نثر: اس میں افسانہ، ناول، ادب لطیف وغیرہ اصناف ادب کی تخلیق ہوتی ہے۔صحافت میں بول چال کی نثر، علمی نثر اورادبی نثر تینوں کا مرکب سامنے آتا ہے۔اس میں عام کاروبار کے معاملات، علمی موضوعات منطقی وعقل انداز بیان کے ساتھ ادب کی گہرا آمیزش ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ صحافت کوادب ہی کا ایک حصہ تصور کیا گیا ہے۔"

(ڈاکٹر صالح عبداللہ: اردو صحافت میں اظہار وابلاغ کے مختلف پیرائے کا تنقیدی جائزہ حصہ اول، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، 2006، ص21)

❑❑❑

Ms. Rohee Jan
Research Scholar
Dept. of Urdu
Kashmir University
Hazratbal
Srinagar-190006 (Jammu & Kashmir)
Mob: 7780844007

منظور احمد گنائی

نسائی ادب اور صاحبہ شہریار

جموں وکشمیر کو اپنے مخصوص جغرافیائی، معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی وتمدنی روایت کے لحاظ سے نمایاں مقام حاصل ہے۔ یہاں صدیوں سے صوفیوں، رشی مُنیوں اور شاعروں وادیبوں کی ایک کہکشاں آباد ہے۔ یہاں خواتین اردو شاعرات کی تعداد اگرچہ قلیل ہے۔لیکن اس قلیل تعداد کے یہاں جو فکر اور شعور نظر آتا ہے اُس نے ادبی دنیا میں اپنی نمائندگی کی ہے۔اپنے نسائی لب ولہجے سے انھوں نے ادب کے لیے جو نایاب جوہر خلق کیے وہ بے مثال ہیں۔ یہاں کی شاعرات نے وقت اور تغیر زمانہ کے ساتھ ساتھ ادب میں بھی ان سارے لوازمات کو برتا، جو ادبی دنیا کے لیے موزوں ومناسب تھی۔انھوں نے ہر دور میں اپنے وجود کو قائم رکھا ہے لیکن مرداساس معاشرے اور شدت پسند مثبت سوچ نے انھیں قابل اعتبار نہیں سمجھا، اور نہ ان کو برابری کا درجہ دیا گیا۔ بلکہ اس کی ذات کے تئیں استحصال، درد وکرب، ظلم وجبر، معاشرے پر ایک بوجھ کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ عصر حاضر میں عورت کی موجودگی کا احساس ہر مرحلے پر مختلف شعبہ جات میں دیکھا جاسکتا ہے جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ صنفِ نازک علم وادب کی آگہی رکھنے میں کسی سے کمتر نہیں ہے۔اردو شاعرات نے اپنی آواز کو عوام تک پہچانے کے لیے عورتوں کے انداز میں اور عورتوں سے منسوب صنفِ غزل کا سہارا لے کر اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔

جموں وکشمیر کے شعری اُفق پر اردو شاعرات کی ایک کہکشاں بیسویں صدی میں ملنی شروع ہوگئی ہے۔اس سے پہلے خواتین کے قلبی احساسات وجذبات کو مرد کے پدرانہ معاشرے، سماج کی بالادستی اور جابرانہ رویے کے تحت اندر ہی اندر دبا دیا جاتا تھا۔ جس کی وجہ سے اُن کی تخلیقی نگارشات کو وہ مقام ومرتبہ نہ مل سکا جو ایک کامیاب شاعرہ سے عبارت ہے۔ جموں وکشمیر میں اردو ادب کی تاریخ کو مرتب کرنے میں تین اہم ادبی شخصیات کا نمایاں رول رہا ہے۔ جن میں سب سے پہلے پروفیسر عبدالقادر سروری کی مایہ ناز تصنیف ''کشمیر میں اردو'' جو تین جلدوں پر مشتمل ہے لیکن اس کتاب میں کسی بھی شاعرہ یا ادیبہ کا ذکر نہیں ملتا۔ دوسری اہم کتاب پروفیسر حامدی کاشمیری کی ''ریاست جموں وکشمیر میں اردو ادب'' منظرعام پر آئی جس میں یہاں کے شاعروں کا تو تذکرہ خوب ملتا ہے لیکن

بنت حوا کا تذکرہ سرے سے غائب ہے۔تیسری اہم اور ادبی تاریخ پروفیسر برج پریمی کی ہے جو 1992 میں ''جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشوونما'' کے نام سے چھپی تھی ،اس کتاب میں بھی حوا کی بیٹی سرے سے غائب رہی ہے۔مذکورہ بالا تینوں کتب کا مطالعہ کرنے کے بعد اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ صاحب تصنیف حضرات نے صرف مرد کو ہی ان کتب کے اوراق میں جگہ دی ہے۔حالانکہ اُن کتب کی اشاعت کے وقت خواتین قلم کار بھی اپنی اپنی تخلیقی لیاقت کا لوہا منوا چکی تھیں لیکن اُن کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔اس بارے میں ڈاکٹر مشتاق احمد وانی رقم طراز ہیں:

> ''جموں وکشمیر کے عوام کی فطرت میں عہد قدیم سے ہی صوفیوں،سنتوں اور درویشوں سے عقیدت اور مذہبی جوش وجذبے کا عنصر کافی حد تک موجود رہا ہے جس کے زیر اثر ''عورت'' کا فنون لطیفہ یا ادبی مجالس میں شمولیت کو معیوب اور قابل ملامت سمجھا جاتا رہا۔مزید یہ بھی کہ مرد نے اس کی ادبی صلاحیتوں کو نہ تو نکھرنے دیا اور نہ ہی قابل اعتنا سمجھا۔

(سالنامہ ہمارا ادب،جموں وکشمیر معاصر نسائی ادب،کلچرل اکیڈمی سرینگر،ص:83)

جہاں تک جموں وکشمیر میں نسائی ادب کا تعلق ہے یہاں بھی دیگر دبستانوں کی طرح خواتین شاعرات کی ایک کہکشاں مل جاتی ہے جو ادبی دنیا میں صنف غزل کی زلفیں سنوارنے میں مردوں کے ساتھ پیش قدمی کرتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔جموں وکشمیر میں جن خواتین شاعرات نے اردو شعروادب میں نہ صرف ریاستی سطح پر اپنی پہچان بنائی بلکہ ملکی سطح پر بھی کامیابی کی کئی منزلیں طے کیں۔ اُن میں ترنم ریاض،نصرت آرا چودھری،سیدہ نصرین نقاش،صاحبہ شہریار،شبنم عشائی اور رخسانہ جبین وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو ادب میں مرد کے مدمقابل خواتین کی اردو شاعری کا حصہ کم ہے لیکن بعض خواتین نے اپنی تخلیقی شعور اور ذوق سلیم سے اردو غزل میں کامیابی کے اعلیٰ مدارج طے کیے ہیں جس سے اردو غزل کی انفرادیت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔

اردو میں نسوانی شعروادب کے بہترین نمونے ابتدائی صورتوں میں انیسویں صدی کے اواخر سے اردو تذکروں میں ملتے ہیں لیکن چونکہ مردوں کے PATRIARCHAL سماج میں عورتیں پس ماندگی، مجبوری اور لاچاری کی زندگی گزارتی تھیں۔اس لیے وہ گوشۂ گمنامی ہی میں کبھی کبھی شاعری سے اپنے ذوق کی تسکین کرتی تھیں۔وہ عموماً مردوں کی نہج کی طرح شعر کہتی اور مردوں کی زبان وطرز اور اسلوب کو بلاتکلف استعمال کرتیں۔بیسویں صدی عیسوی کی نصف دہائی سے جموں وکشمیر میں نسائی لب ولہجے سے آراستہ شاعرہ صاحبہ شہریار نئے موضوعات اور نئے طرز وفکر لے کر اردو ادب میں نمودار ہوئی۔

یہ ایک خوش آیند بات ہے کہ وادی کشمیر میں اپنی بودوباش رکھنے والی نوآمدہ شاعرات میں صاحبہ شہریار بھی اپنے شعری کائنات کے فنی اور جمالیاتی آگہی سے اپنے نسائی وجود کی تلاش میں سرگرداں نظر آرہی ہیں۔صاحبہ شہریار کی شاعری میں جس منفرد لب ولہجے اور فصاحت وبلاغت سے کام لیا گیا ہے اس بارے میں پروفیسر حامدی کاشمیری ''شاخ لرزاں'' کے دیباچے میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

> ''ان کے کلام میں ایک ایسی ذکی الحس،مہذب،باوفا اور جذباتی عورت اُبھرتی ہے جو آغاز جوانی کے شیریں اور نازک خوابوں کے ساتھ ساتھ ان خوابوں کی شکست کے دردوغم سے بھی متصادم ہے۔اسے اپنی ذات،جذبہ واحساس،نرگسیت ،پیار اور خوابوں سے اتنی وابستگی ہے کہ بیاہتا زندگی میں بھی مختلف نشیب وفراز سے گزر کر ان سے دست بردار ہونے پر آمادہ نہیں۔وہ گرہستن بھی ہے،شوہر اور اپنے پریوار کی طرف متوجہ بھی،اور خارجی زندگی کی شکست وریخت سے آگاہ بھی ہے۔لیکن دل کے نہاں خانوں میں عشق کی لطافتوں ،نزاکتوں،جدائی کے صدموں اور رشتوں کی اسراریت کو محفوظ رکھتی ہے،اور اسے سرمایہ جان سمجھتی ہے۔''

(شاخ لرزاں،دیباچہ از پروفیسر حامدی کاشمیری،ص18-17)

واضح رہے یہ عورت جو صاحبہ کے کلام میں اُبھرتی ہے ایک فرضی عورت ہے اور اس کا حقیقی صاحبہ سے ہونا کوئی ضروری نہیں۔

جوں جوں مجھ پر راز وہاں کے کُھلتے گئے
آنکھوں پر حیرانی کا اک ہالہ ہے

صاحبہ شہریار کی پیدائش 1953 میں وادی کشمیر کے شہر سری نگر میں ہوئی۔اُن کی ابتدائی تعلیم سری نگر میں ہی ہوئی ، ایم۔اے کشمیر یونیورسٹی سے پاس کیا اور پنجاب یونیورسٹی سے موسیقی کی تعلیم حاصل کی۔طالب علمی کے زمانے سے ہی شعرگوئی کی طرف اپنے آپ کو منتقل کیا۔چونکہ انھیں شعر گوئی اور مضمون نگاری کا مذاق وراثت میں ملا تھا۔صاحبہ کی پرورش وادی کشمیر کی حسین وجمیل وادیوں میں ہوئی۔زندگی کی تلخ وشیریں حقیقتوں اور اردگرد کی زندگی کے مشاہدات،تحقیقات ومحسوسات نے انھیں ایک حساس اور جذباتی شاعرہ بنانے میں نمایاں رول ادا کیا اور آج ہم صاحبہ کو عصر حاضر میں ایک باوقار شاعرہ کے روپ میں دیکھ رہے ہیں جس کے یہاں وہ سب

کچھ موجود ہے جو ایک باکمال شاعرہ سے عبارت ہے۔

اُن کے اب تک چار شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جنھیں ادبی حلقوں میں کافی سراہا گیا ہے۔"شاخ لرزاں"2004 ،"برگ چنار" 2007،کرب زار2011 (والد محترم کا ترتیب کردہ شعری مجموعہ)، "آ گہی کا درد"2014 اور آخری شعری مجموعہ "صریر خامہ" کے نام سے 2017 میں شائع ہوا ہے۔صاحبہ شہر یار عہد حاضر کی ایک توانا اور فعال شاعرہ کی حیثیت سے کسی تعارف کی محتاج نہیں۔گزشتہ دو تین عشروں کے دوران اردو کے شعری اُفق پر عظمت و وقار حاصل کرنے والی شاعرات کی صف میں صاحبہ شہر یار کافی اہمیت کی حامل ہے۔ان کی شاعری میں نسوانی حیثیت اور نسوانی جذبات کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔صاحبہ شہر یار کے شعری مجموعوں کے عناوین نہ صرف حدیث حسن ، بلکہ حکایت روزگار اور عصری کرب کے بھی آئینہ دار ہیں۔

ان کے اشعار نرم لب و لہجے میں زندگی کے تلخ حقائق،کرب ذات اور سوز دروں کی صدائے بازگشت ہیں۔ان کا شعور فکر و فن،ندرت زبان و بیان،بلند پروازی،خیال و عصری حیثیت کا مظہر ہے۔اُن کے دل میں ایک دردمند دل دھڑکتا ہے جو ایک شعری پیکر کی صورت میں اُن کے متعدد اشعار میں نمایاں ہے۔

ہر اک سے محبت سے پیش آو زمانے میں
جینے کا میرے دل نے اک رستہ دکھایا ہے
صاحبہ غم کی یہ سوغات کہاں ملتی ہے
درد کی دنیا سے میں نہیں گزر جاؤں گی

انھوں نے متعدد اشعار میں اتحاد باہمی اور رواداری کو بھی موضوع سخن بنایا ہے جس کا ایک نمونہ حسب ذیل ہے۔

جہاں میں صاحبہ سب لوگ مل کے ساتھ ہیں
جہاں میں جینے کے وہ راستے نکالوں گی

اجتماعی زندگی کی شکست و ریخت،فرض ناشناسی جو عہد حاضر کا ایک تلخ سچ ہے صاحبہ شہر یار کے اس شعر سے آنکھوں کے سامنے عیاں ہو جاتا ہے۔

عجیب بات ہے بھائی کو بھی نہیں معلوم
جہاں میں فرض جو ہوتا ہے ایک بھائی کا

صاحبہ شہر یار کی غزل گوئی میں اشعار جتنے سادہ اور سلیس ہیں اُتنی ہی گہرائی ان کے اندر پیوست ہیں۔خیال کی بلندی ،یگانگت،شدت احساس اور جذبات ان کی غزل گوئی کی اہم خصوصیات ہیں۔انھوں نے اپنی زندگی خالص اردو شاعری کے لیے وقف کردی اور زمانہ حال میں بھی پوری کاوش کے ساتھ ادبی سرگرمیوں میں سعی جمیل کرتی ہوئی نظر آرہی ہیں۔پروفیسر حامدی کاشمیری ان کی غزل گوئی کے بارے میں شاعری کے مجموعے"آ گہی کا درد" میں یوں رقم طراز ہیں:

> "آ گہی کا درد" میں ایک خود آ گاہ عورت کا کردار اُبھرتا ہے جو حد درجہ دردمند اور حساس ہے،وہ گرد و پیش کے معاشرے میں اونچ نیچ کے پیدا کردہ انسانی دکھ کو شدت سے محسوس کرتی ہیں۔خاص طور پر اُن کی نظر طبقہ نسواں کی بے چارگیوں اور مایوسیوں پر مرکوز رہتی ہے۔وہ اس دُکھ کو ذاتی سطح پر محسوس کرتی ہیں،وہ اپنی شخصیت کا تحفظ کرنے کے لیے رومانی خوابوں،آرزوؤں کی حسین وادیوں،فطرت کے حسین مناظر اور رشتوں کی پاکیزگی میں پناہ لینے کی کوشش کرتی ہیں۔لیکن یہ رویہ دور تک فن کا ساتھ نہیں دیتا اور وہ خوابوں کی شکست سے دوچار ہوتی ہیں اور ان کی المنا کی فزوں تر ہوتی ہے۔اس طرح سے خواب اور شکست خواب اُن کی شعری رویے کی پہچان ہیں۔کہیں کہیں ان کا دردمندانہ لہجہ اُن کی شعری حسیت پر حاوی ہو جاتا ہے۔"

(آ گہی کا درد،دیباچہ حامدی کاشمیری،ص13)

چنانچہ اس اقتباس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست ہے کہ صاحبہ شہر یار عہد حاضر میں نسائی ادب کے فروغ کے لیے اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کا استعمال بڑی خوبی کے ساتھ کرتی ہوئی نظر آرہی ہیں۔"صریر خامہ" اُن کا ایسا شعری مجموعہ ہے،جس کو اُن کے سابقہ مجموعوں کی طرح ارباب فکر و نظر نے نسائی ادب میں قابل قدر اضافہ قرار دیا ہے۔

صاحبہ کا رنگ تغزل،قدیم وجدید اسالیب سخن کا ایک خوشنما امتزاج ہے۔انھوں نے اپنی شاعری میں قدیم کلاسیکی روایات کے ساتھ ساتھ جدید عصری میلانات ورجحانات میں بھی فکر کے نئے نئے زاویے تلاش لیے ہیں۔اُن کے غزلوں میں داخلی کرب،شدت جذبات اور زندگی کی سچائیوں کو گہرائی تک لینے کی فطری صلاحیت اور لیاقت موجود ہے۔صاحبہ کی شاعری کا خاص وصف یہ ہے کہ یہاں آورد کا شائبہ بھی نہیں ہے،صرف آمد سے ہی اپنے تخلیقی شعور کو فن کی بلندیوں تک پہنچایا گیا ہے ان کی شعری زبان سادہ،سہل،سلیس،صاف ستھری اور آسان ہے۔"صریر خامہ" کی غزلوں کی خصوصیات فاروق ارگلی اس طرح بیان کرتے ہیں:

"صریر خامہ کی ایک سو سات غزلوں میں ایک محبت کرنے والی جذباتی عورت کے جذبات،ہجر و وصال کا کیف و کرب،محرومی و کامرانی اور غم و خوشی ہر طرح کی کیفیات کی بھر پور عکاسی کے ساتھ ساتھ عصری حسیت اور زندگی کے نشیب و فراز کو ایک دوربین شاعر کی نگاہ سے دیکھنے کی وہ خوبیاں موجود ہیں جو شاعر کے فن کو اعتبار بخشنے کے لیے کافی ہیں۔"

(صریر خامہ،فاروق ارگلی،ص24)

ریاست جموں وکشمیر کی اردو شاعرات میں صاحبہ کی آمد ایک نیک فال کے طور پر سامنے آئی۔وہ کشمیر کی نسائی شعری روایت سے شعوری سے زیادہ لاشعوری طور پر اکتساب فیض حاصل کرتے ہوئے اپنے شعری وجود کو اُبھارنے کی سعی کر رہی ہیں۔صاحبہ کی اردو شاعری میں کشمیری سماج میں اپنی تہذیبی روایات کے پس منظر میں نسائیت کی مہذب،شائستہ اور انسانی اقدار کا جگہ جگہ احساس ہوتا ہے۔وہ اپنے محبوب کی بے اعتنائی،فرقت یا لاپرواہی سے رنجیدہ تو ہوتی ہیں۔مگر کھلے میدان میں پروٹسٹ یا لاتعلقی کا اظہار نہیں کرتیں۔یہی وجہ ہے کہ اُن کے اشعار میں اُن کی شخصیت کے رنگ بھی جھلکتے ہیں اور محبوب کے وجود کا نور و پرتو بھی دکھائی دیتا ہے۔

میری آنکھوں میں اُترتا ہے تجلی کی طرح
نور کے دریا میں پھر اپنے بہاتا ہے مجھے

تم نے پوچھا بھی تو کس موڑ پہ آ کر پوچھا
کیسے اُجڑتا ہے مہکتا ہوا گھر بارش میں
بند دروازے پہ دستک دے کر
بھیگی راتوں میں جگاتی ہے ہوا

صاحبہ شہر یار ہمیشہ سے قدرتی مناظر اور حسن فطرت سے بے پناہ محبت کرتی ہیں۔وہ کشمیر کی بے مثل خوبصورتی سے بہت متاثر ہیں۔ان کی غزل گوئی میں کشمیر کی آب وہوا،وہاں کی تہذیبی اور ثقافتی روایات کے خوبصورت جلوے ملتے ہیں۔وہ حُسن فطرت میں ایسا ہی خوشبو محسوس کرتی ہیں جو اُن کے نسائی جوہر سے پھوٹتی اور محبوب سے رشتے کی پہچان بھی ہے یہ خوشبو بار باران کے اشعار کو بھی معطر کرتی ہے۔

گلشن گلشن نور کی شبنم بکھری ہے
پتہ پتہ خوشبوں سے مہکا ہے

اوپر ذکر کیے گئے شعر میں صاحبہ شہر یار کی نسائی آواز کے اضافے کا قائل ہونا پڑتا ہے انھوں نے نسائی جذبات واحساسات کو جس فکر اور شعور سے آراستہ کیا اس کا اعتراف ہر ایک کو کرنا پڑے گا۔صاحبہ شہر یار کی شاعری احساس کی شاعری ہے اس بارے میں فاروق ارگلی "آگہی کا درد" شعری مجموعے میں یوں رقم طراز ہیں:

"صاحبہ شہر یار کی شاعری نسائی جذبات واحساسات کی آواز ہے۔محبت کے پاکیزہ تخیل کی مدھم مدھم آنچ میں پگھلتی ہوئی آرزوئیں غزل کے پیکر میں ڈھل کر محض ایک شاعرہ کی داخلی حسیت کا اظہار نہیں بلکہ لاکھوں دھڑکتے ہوئے دلوں کے ترجمان بن جاتی ہیں۔سادگی اور برجستگی سے اپنے دل کی بات کہہ دینا صاحبہ کا کمال فن ہے جو انھیں اُردو دنیا کی نامور شاعرات کی صف میں ممتاز مقام عطا کرتا ہے۔غالباً وہ ہمارے عہد میں اردو کی واحد شاعرہ ہیں جو مشاعروں میں اپنا کلام نہیں سناتیں،مگر ان کی شاعری پڑھنے والوں کو اپنے ذہنوں میں ایک خاص طرح کی نغمگی کا احساس ہوتا ہے۔"

(آگہی کا درد،فاروق ارگلی،ص16-15)

صاحبہ کی بطور شاعرہ انفرادیت یہ بھی ہے کہ اردو کی بیشتر شاعرات کی طرح اُن کی شعر گوئی کسی استاد یا رہنما کی مرہون منت نہیں،وہ پہلے سے سوچ سمجھ کر قافیہ پیمائی نہیں کرتیں،بلکہ خیالات کا وفور جب بھی ذہن کو وجدانی کیفیت سے دوچار کر دیتا ہے تو دلی کیفیات شعر کی صورت میں ظاہر ہو جاتی ہے۔ان کی شاعری صنائع بدائع اور پیکر تراشی سے مبرا بلکہ فطری

سادگی اُن کے اشعار میں گردش کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔لہجے کی صلابت،غزل کے اصول وضوابط کی پاسداری اور الفاظ کا دروبست ان کے کلام کو ہر دل عزیز بنا دیتا ہے۔بادی النظر میں صاحبہ کی شاعری منجملہ نسائی جذبوں کی مکمل شعری تفسیر ہے۔آرزوؤں کی خلش پیہم،خوابوں کے رنگ،چاہتوں کی تڑپ،دوریوں کے کرب،مایوسیوں کی کسک اور درد دل آشنا کی روداد سے ان کا کلام گل سرسبد کے مانند ہے۔طبقۂ نسواں کی بے چارگیوں اور محرومیوں کا انھیں بے حد احساس تھا وہ اس کا اظہار اپنے کلام میں جگہ جگہ کرتی ہیں۔ان کے کلام پر اظہار خیال کرتے ہوئے احمد علی برقی لکھتے ہیں:

"ان کے اشعار نرم لب ولہجے میں زندگی کے تلخ حقائق ،کرب ذات اور سوز دروں کی صدائے بازگشت ہیں۔ان کا شعور فکروفن،ندرت زبان وبیان ،مضمون آفرینی ،بلند پروازیٔ خیال وعصری حیثیت کا مظہر ہے۔"

(صریرخامہ۔صاحبہ شہریار:ص15)

لیکن ان کے یہاں زندگی اور معاشرے کے عصری تقاضوں کے ساتھ ساتھ تجربات، مشاہدات اور فکری رچاؤ بھی نمایاں ہے۔لیکن کہیں کہیں وہ اپنی مخصوص انداز میں بڑی سادگی وپرکاری سے ایسے شعر بھی بیان کرتی ہیں جو واقعی سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ذیل میں کچھ اشعار بیان کیے جائیں گے جن سے بہ خوبی اندازہ ہوگا کہ صاحبہ شہریار جدید دور میں نسائی لب ولہجے کی ایک باکمال اور متحرک شاعرہ ہیں۔

رات کی خاموشی میں کس کے ہونے کا احساس تھا یہ
اک دن چھو کر دیکھا میں نے میرا اپنا سایہ تھا
دنیا کا میلہ ہے ہر سُو پھر بھی ہم سب تنہا ہیں
سب کی اپنی اپنی دنیا ساتھ کہاں تک جائیں گے
لائے تھے اک پودے کو ہم دور سے مگر
وہ اپنی مٹی چھوڑ کر بھی دے کے پھل گیا

صاحبہ کی غزلوں میں ایسے اشعار کی کمی نہیں جن میں فکری احساس کی فراوانی نہ ملتی ہیں۔ایسی خصوصیات اسی فنکار کے ہاں موجود ہوسکتی ہیں جسے وسعت فکر ونظر کی پاسداری ہو۔صاحبہ کا شعری سفر ہنوز جاری ہے۔اُن کی شاعری فکرواحساس کی شاعری ہے ان کی شاعری داخلی اور خارجی تجربات، مشاہدات اور قلبی جذبات واحساسات کی آئینہ دار ہے۔انھوں نے اپنی ذاتی زندگی اور اپنے اطراف واکناف کی زندگی کے غم، افسردگی، حزن وملال،سیاسی ناہمواری،معاشی بدحالی،سماجی پستی اور تہذیبی قدروں کی شکست وریخت کو شعری قالب میں ڈھالنے کے لیے انوکھے انداز اور خوبصورت تشبیہات واستعارات کا استعمال کرکے حسین پیکر تراشے ہیں۔لہجہ ان کا اپنا تھا اور اسی نسائی لہجے میں انھوں نے اپنے خیالات کو زبان دی جس کو زمانے کی گرد ماند نہیں کرسکتی۔

مجموعی طور پر یہ کہ جاسکتا ہے کہ اردو ادب کی ترقی وپرداخت میں خواتین ادیبوں کا بھی نمایاں رول رہا ہے۔یعنی خواتین ہر سطح پر پہلے سے زیادہ کامیابی کے ساتھ مصروف عمل ہیں۔عصر حاضر میں خواتین جن مسائل سے دوچار ہیں ان مسائل کو اپنی شاعری میں پیش کرتی ہیں۔خواتین آج ہر میدان میں کامیاب نظر ہیں۔

□□□

Manzoor Ahmad Ganie
Academic Councellor IGNOU
Govt Womens Degree College Anantnag
Hussan Pora Bagh Teh.Bijbehara
Dist.Anantnag-192124(J&K)
E-mail.mganie283@gmail.com
Mob.6005903959

ڈاکٹر مسرت

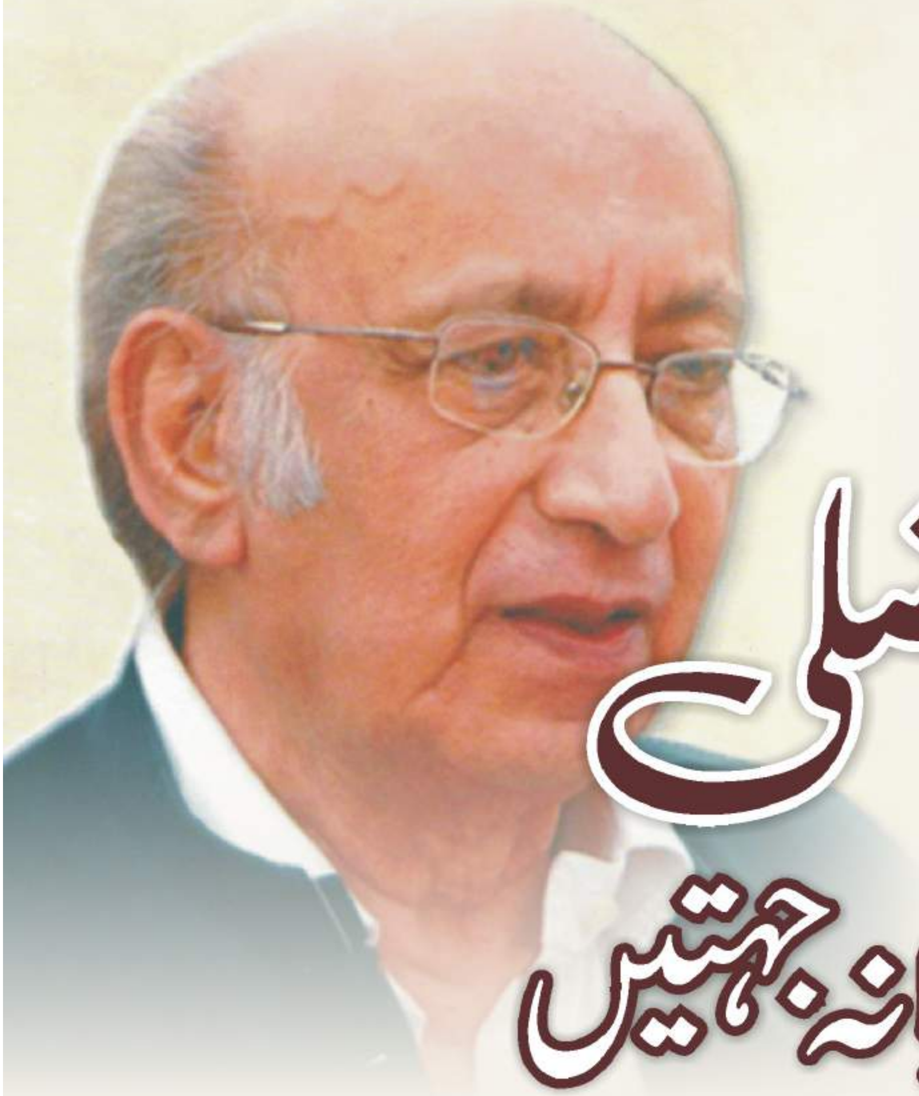

ندا فاضلی کی شاعرانہ جہتیں

ندا فاضلی جدیدیت کے دور کے اہم شاعر مانے جاتے ہیں۔اس تحریک کے زیر اثر بہت سے ادیب و شاعر ابھرے۔نئی شاعری اور نئے ادب کے لیے جو ایجنڈا سامنے رکھا گیا ان میں بے چہرگی، تنہائی، افسردگی، تجریدیت اور علامت پسندی کو نئے ادب کا جوہر قرار دیا گیا۔شمس الرحمٰن فاروقی جدیدیت کے روح رواں مانے جاتے ہیں۔اس تحریک کے زیر اثر جو شاعر ابھر کر سامنے آئے ان میں جاں نثار اختر، اختر الایمان، ساحر لدھیانوی وغیرہ اہم ہیں۔ندا فاضلی بھی جدیدیت کے دور کے اہم شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔گو کہ انھوں نے غزل کی شاعری بہت کم کی لیکن ان کی نظمیں عوام کے لیے توجہ کا باعث ہیں۔انھوں نے زیادہ توجہ نثری نظموں پر صرف کی۔ان کی بیشتر شاعری میں احساس و جذبات کی تابانی نظر آتی ہے۔لیکن انھوں نے ایسے بہت سے پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے جو ان کی شاعری کا خاصہ کہے جا سکتے ہیں۔احساس کی نزاکت کو بھی وہ فنی پیرائے میں بیان کرنے پر قدرت رکھتے ہیں:

جب بھی کسی نگاہ نے موسم سجائے ہیں
تیرے لبوں کے پھول بہت یاد آئے ہیں
نکلے تھے جب سفر یہ تو محدود تھا جہاں
تیری تلاش نے کئی عالم دکھائے ہیں
دن سلیقے سے اگا رات ٹھکانے سے رہی
دوستی اپنی بھی کچھ اور زمانے سے رہی

ندا فاضلی نے ہجرت کا کرب برداشت کیا تھا،مہاجروں کے دکھ درد جھیلے تھے۔ان کا حساس دل ان کو اس بابت بہت بے چین رکھتا ہے اور وہ سراپا غم کی تصویر بن جاتے ہیں۔زندگی کے فاصلے کو وہ وقت کے فاصلے سے تعبیر

کرتے ہیں۔اکیلاپن، ہجر کی کسک کا بیان ان کی نظم 'فاصلہ' میں ملاحظہ کریں:

یہ فاصلہ/جو میرے اور تمھارے درمیاں ہے/رہ
اک زمانے کی داستاں ہے/نہ ابتدا ہے/نہ انتہا
ہے/مسافتوں کا عذاب سانسوں کا دائرہ ہے/نہ
تم کہیں ہو/نہ میں کہیں ہوں/تلاش رکھیں واہمہ
ہے/سفر میں لمحوں کا کارواں ہے/یہ فاصلہ!/جو
تمھارے اور میرے درمیاں ہے/یہی طلب
ہے/یہی جزا ہے/یہی خدا ہے

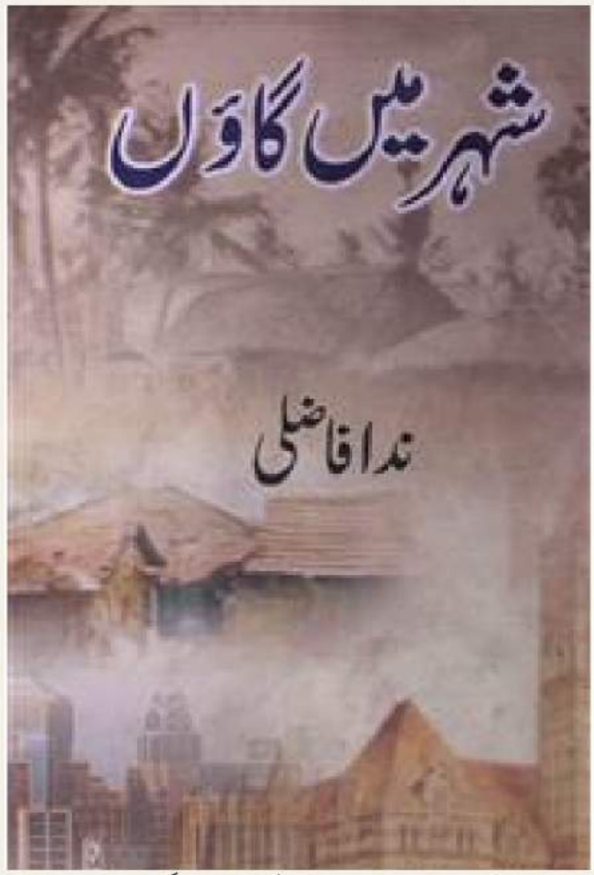

ان کی بیشتر شاعری کا محرک تنہائی اور بے چارگی ہے۔ان کے کلام میں بے بسی، تنہائی اور بے چارگی کی کیفیت کو جگہ جگہ محسوس کیا جاسکتا ہے۔ بھیڑ میں رہتے ہوئے بھی آج کا انسان اکیلا اور تنہا ہے۔انسان کی تنہائی کو وہ کس انداز سے اپنی غزل میں پیش کرتے ہیں:

ہر طرف ہر جگہ بے شمار آدمی
پھر بھی تنہائیوں کا شکار آدمی
صبح سے شام تک بوجھ ڈھوتا ہوا
اپنی ہی لاش کا خود مزار آدمی

ندا فاضلی کے لہجے میں کرب ہے۔انسان افراتفری کے ماحول سے گھبرا گیا ہے۔بھیڑ میں رہتے ہوئے بھی وہ اپنے آپ کو بے یارومددگار محسوس کرتا ہے۔زندگی کی تگ ودو سے لڑتا ہوا وہ کہیں نہ کہیں اپنی اس کیفیت سے انجان اور نا آشنا نہیں ہے۔روزی روٹی کی تلاش اور گھر گرہستی کی خاطر وہ صبح کا نکلا شام میں ہی گھر میں داخل ہوتا ہے۔مادی چیزوں کی خواہشات نے انسان کو مشین بننے پر مجبور کر دیا ہے۔اس کی یہ کیفیت کبھی کبھی اس کو بے چارگی کا احساس کراتی ہے اور وہ ٹوٹتا اور بکھرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔اشعار دیکھیں:

تنہا بھٹک رہا ہے انجانی سی راہوں میں
شاید وہ اپنے ساتھ اپنے شہر کو لانا بھول گیا
زندگی کا مقدر سفر در سفر
آخری سانس تک بے قرار آدمی

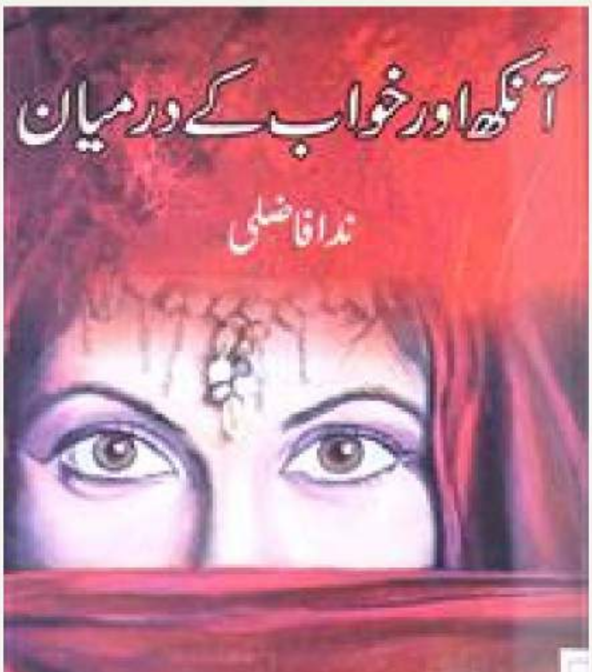

ندا فاضلی روایت کے پرستار نظر آتے ہیں۔وہ اپنی روایت کا بھرم باقی رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو بھی اس کی حفاظت کا امین گردانتے ہیں۔اپنی جڑوں سے جڑے رہنے کا احساس ان کو بار ہا ہوتا ہے اور ان کو یاد آتا ہے پیپل کا وہی پرانا بوڑھا درخت۔روایت سے بغاوت

ان کا شیوہ نہیں بلکہ وہ آتم سمرپن کے ذریعے ہندوستان کی مٹتی اقدار پر نوحہ کناں ہیں اور اس پر دکھی اور پژمردہ نظر آتے ہیں:

گھر کو کھوجیں رات دن، گھر سے نکلا پاؤں
جس کے آگے ماند تھے سارے وید حکیم
بوڑھا پیپل، گھاٹ کا، بتیائے دن رات
جو بھی گزرے پاس سے سر پر رکھ دے ہاتھ
وہ رستہ ہی بھول گیا، جس رستے تھا گاؤں

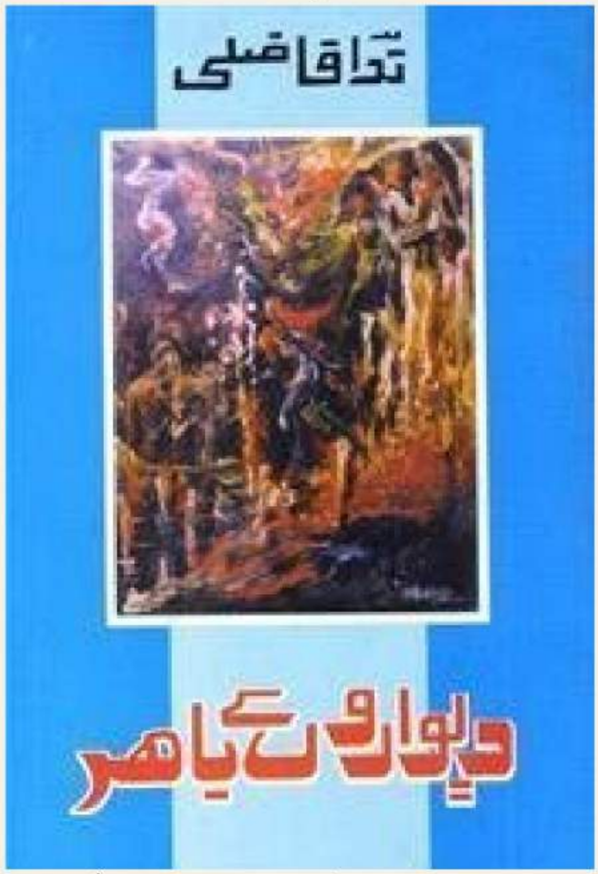

ندا فاضلی اپنے دھیمے لہجے میں اپنے دکھ کا اظہار اپنی نظموں میں کرتے ہیں۔ ان نظموں میں سماجی شعور بھی نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری میں جو بے بسی اور کرب موجود ہے وہ ان کا ذاتی بھی ہوسکتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ان کو کسی کا شدت سے انتظار ہے۔ ان کی آنکھیں کسی کے انتظار میں پتھرا گئی ہیں یا آنے والے نے اپنا راستہ بدل لیا ہے۔ ان کی نظم انتظار دیکھیں:

مدتیں بیت گئیں/تم نہیں آئیں اب
تک/روز سورج کے بیاباں میں/بھٹکتی ہے
حیات/چاند کے غار میں/تھک ہار کے سو
جاتی ہے رات/پھول کچھ دیر مہکتا ہے/بکھر
جاتا ہے/ہر نشہ/لہر بناتے ہی اتر جاتا
ہے/وقت!/بے چہرہ ہواؤں سے گزر جاتا
ہے/کسی آواز کے سبزے میں لہک جیسی
تم/کسی خاموش تبسم میں چمک جیسی تم

ندا فاضلی کو بہت سے انعام واکرام بھی ملے لیکن ان کی شناخت فلمی نغموں سے زیادہ ہوئی۔ انھوں نے ہندی فلموں کے لیے بہت سے گیت لکھے۔ کالم بھی تحریر کیے۔ انھوں نے بہت سے نغمے لکھے جس میں سے بہت سے مقبول بھی ہوئے:

تو اس طرح سے میری زندگی میں شامل ہے
کہیں بھی جاؤں یہ لگتا ہے تیری محفل ہے

ندا فاضلی کو عوامی شاعر کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ وہ اردو، ہندی کے ادیب و شاعر تھے۔ ان کا لب ولہہ بالکل عام فہم اور سادہ تھا۔ ان کے مخاطب بہت عام سے لوگ تھے اور انھوں نے ان ہی کی زبان میں شاعری کی اور اپنی شناخت قائم کی۔ شاعری میں وہ میرا اور کبیر کے شعری مزاج سے زیادہ متاثر تھے۔

ندا فاضلی (1938) میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت دہلی میں ہی ہوئی۔ ان کے والد صاحب بھی شاعر تھے اور ڈبائیوی تخلص کرتے تھے۔ گھر میں شاعری کا مزاج تھا۔ ندا فاضلی نے بھی اسی ماحول میں پرورش پائی اور شعری مزاج ان کی شخصیت کا حصہ بن گیا۔ 1964 میں وہ ممبئی آگئے یہاں ان کی ملاقات کمال امروہوی سے ہوئی۔ جنھوں نے ان کو فلم 'رضیہ سلطان' کے لیے نغمے لکھنے کا آفر دیا۔ اس فلم کے نغموں کو جاں نثار اختر لکھ رہے تھے لیکن ان کا انتقال ہونے کے سبب ندا فاضلی نے اس فلم کے نغمے لکھے اور وہ بہت مشہور ہوئے۔ وہ عوام میں اس وجہ سے بھی زیادہ مشہور ہوئے کہ ان کا لب ولہجہ روایتی ہونے کے ساتھ ساتھ عام فہم بھی تھا۔ فلموں سے ان کا ایک رشتہ بن گیا۔ ان کی غزلوں کو جگجیت سنگھ اور ان کی بیگم چترا سنگھ نے اپنی آواز میں بھی گایا۔

'لفظوں کا پل' ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ جو انھوں نے ممبئی آنے سے قبل لکھا تھا۔ وہ بطور نغمہ نگار ساحر لدھیانوی، مجروح، گلزار یا اختر الایمان کی طرح کامیابی نہ حاصل کر سکے لیکن شاعر ہونے کے ناطے انھوں نے ادب پر اپنی انمٹ چھاپ چھوڑی۔ ان کے شعری مجموعوں میں 'آنکھ اور خواب کے درمیان' 'مور ناچ'، 'شہر تو میرے ساتھ چل'، 'دنیا مرے آگے'، 'زندگی کی طرف'، 'شہر میں گاؤں' اور 'کھویا ہوا سا کچھ' اہم ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے دو سوانحی ناول 'دیواروں کے بیچ' اور 'دیواروں کے

باہر' کے علاوہ مشہور شعرا کے خاکے 'ملاقاتیں' کے عنوان سے لکھیں۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، اسکرین ایوارڈ سے ان کو نوازا گیا۔ 2013 میں حکومت ہند نے انھیں 'پدم شری' جیسے معتبر ایوارڈ سے سرفراز کیا۔ ان کی شاعری کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے وارث علوی لکھتے ہیں:

"ندا فاضلی اردو اور ہندی کے اک ایسے ادیب، شاعر، نغمہ نگار، مکالمہ نویس اور صحافی تھے جنھوں نے اردو شاعری کو اک ایسا لب و لہجہ اور اسلوب دیا جس کو اردو ادب کی اشرافیہ نے ان سے پہلے قابل اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ ان کی شاعری میں سنتوں کی بانی جیسی سادگی، اک قلندرانہ شان اور لوک گیتوں جیسی مٹھاس ہے۔ ان کے مخاطب عام لوگ تھے لہٰذا انھوں نے ان کی ہی زبان میں گفتگو کرتے ہوئے لطیف اور غیر جارحانہ طنز کے ذریعہ دل میں اتر جانے والی باتیں کیں۔ انھوں نے امیر خسرو، میر، رحیم اور نظیر اکبر آبادی کی بھولی بسری شعری روایت سے دوبارہ رشتہ جوڑنے کی کوشش کرتے ہوئے نہ صرف اس روایت کی بازیافت کی بلکہ اس میں عصر حاضر کی لسانی ذہانت جوڑ کر اردو کے نثری ادب میں بھی نئے امکانات کی نشاندہی کی۔"

(مضمون وارث علوی، ندا فاضلی پر، ماخذ: ریختہ ویب سائٹ)

ندا فاضلی کے کلام میں شفافیت، لطافت اور شوخی بھی جگہ جگہ ہمیں نظر آتی ہے۔ یہ کیفیات اگر شاعر میں موجود ہوں تو اس کو ہم عمدہ شاعر قرار دے سکتے ہیں۔ ان کی شاعری کی قرات کرتے ہوئے قاری کو ذہنی ورزش سے نہیں گزرنا پڑتا۔ ان کا لہجہ بہت عام اور روایتی سا ہوتا ہے۔ سادہ اور عام فہم لہجے کی شاعری ندا فاضلی کا خاصہ ہے۔

منہ کی بات سنے ہر کوئی دل کے درد کو جانے کون
آوازوں کے بازاروں میں خاموشی کو پہچانے کون
وہ میری پرچھائیں ہے یا میں اس کا آئینہ ہوں
میرے ہی گھر میں رہتا ہے مجھ جیسا ہی جانے کون

بچپن کی تصویر کشی، زندگی کے تضادات، اپنے مقاصد کی تلاش انسانی رشتوں کی نزاکتیں اور گمشدہ چیزوں کی تلاش ان کی شاعری کا مرکز محور قرار دیا جاسکتا ہے۔ اپنی ماں سے ان کو جذباتی لگاؤ تھا۔ ان کی شاعری کے کرداروں میں آنگن، دھوپ، چھاؤں، بوڑھا پیپل، بازار، تنہائی اور راستے سے گزرتی دوشیزائیں اہم کردار ہیں۔ ماں کا کردار ان کے لیے مقدس اور اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے ماں کے لیے ایک جذباتی اور پر اثر نظم تخلیق کی ہے جو ان کی ماں سے جذباتی رشتے کو ظاہر کرتی ہے:

بیسن کی سوندھی روٹی پر کھٹی چٹنی جیسی ماں
یاد آتی ہے! چوکا باسن چمٹا پھکنی جیسی ماں
بانس کی کھری کھاٹ کے اوپر ہر آہٹ پر کان دھرے
آدھی سوئی آدھی جاگی تھکی دوپہری جیسی ماں
بیوی بیٹی بہن پڑوسن تھوڑی تھوڑی سی سب میں
دن بھر رسی کے اوپر چلی نٹنی جیسی ماں

ندا فاضلی اردو کے عمدہ شاعر ہیں لیکن ہندی الفاظ کا بھی بڑی خوبصورتی سے استعمال کرتے ہیں اور اپنے کلام میں نئی جدتیں پیدا کرتے ہیں جو ان کی شخصیت کا پتہ دیتی ہیں۔ ندا فاضلی نے بہت کم عرصے میں اپنی پہچان ادبی حلقوں میں بنائی۔ ان پر معاصر ادبی ریوں کا زیادہ اثر ہے۔ انھوں نے زیادہ تر سیاسی اور سماجی نظمیں لکھیں۔ عوامی بولی کو بھی انھوں نے اپنایا۔ ان کی شاعری میں ہندوستانیت نظر آتی ہے اور اس ہندوستانیت میں فنی شعور رچا بسا دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے لطیف اشارات، گہرے جذبات اور انفرادی احساسات سے اپنی شاعری میں دلکشی پیدا کی۔ اس البیلے شاعر نے 2016 کو اس دار فانی سے کوچ کیا۔

Dr. Musarrat
Delhi

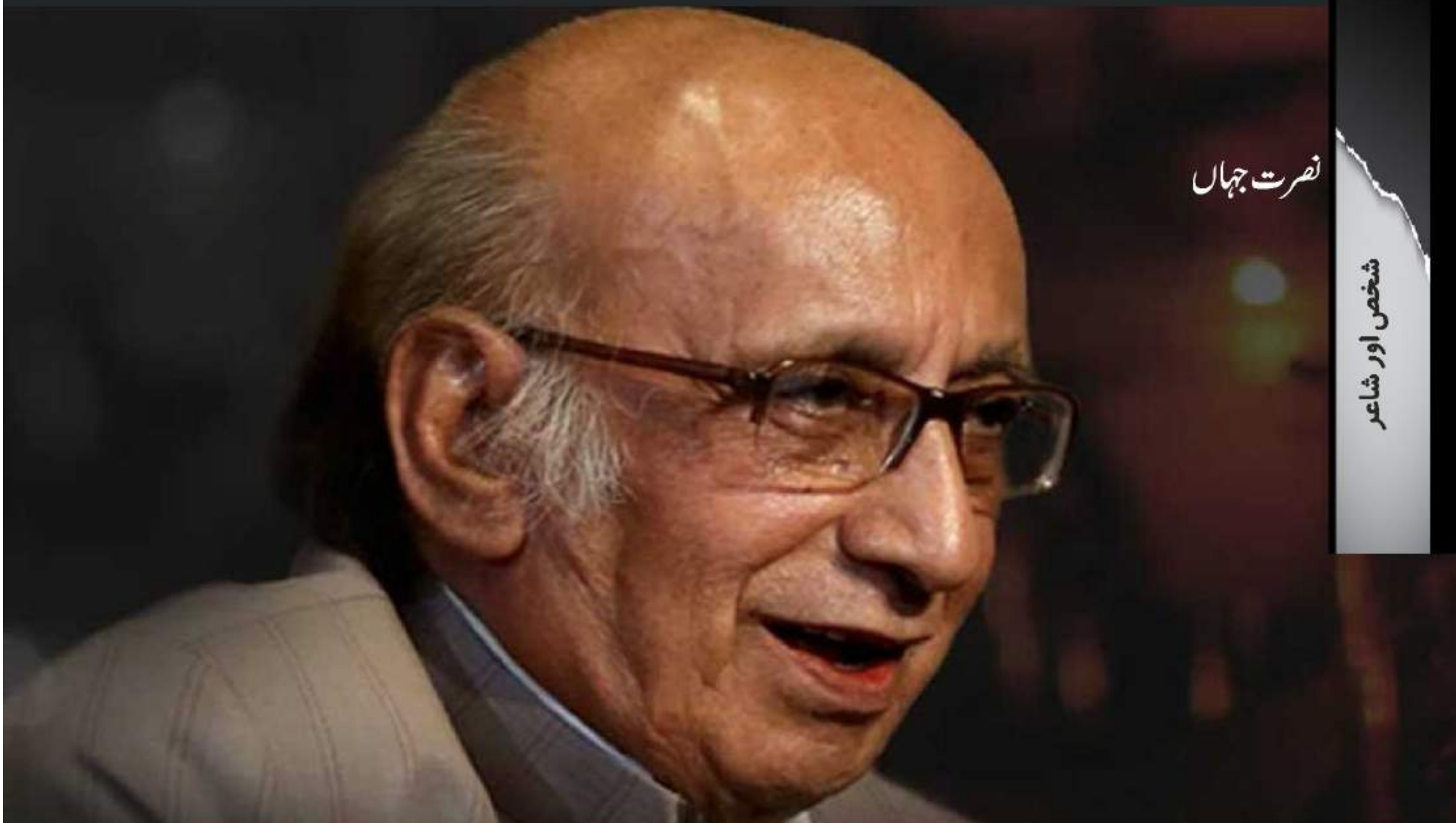

نصرت جہاں

ندا فاضلی کے منفرد کلام کی عکاسی

وہ آدمی تھا کتنا بھلا کتنا پرخلوص
اس سے بھی آج لیجیے ملاقات ہو گئی

ندا فاضلی کا پورا نام مقتدا حسن تھا۔ وہ 12 اکتوبر 1938 کو اپنے نانیہال دہلی میں پیدا ہوئے۔ بقول ندا فاضلی ان کا سلسلہ نسب کشمیر کے فاضلہ علاقے سے ملتا ہے۔[1] ان کے آباواجداد کشمیر سے ہجرت کرکے اتر پردیش کے ضلع بلند شہر کے قصبہ ڈبائی میں سکونت پذیر ہوگئے۔ ان کے والد گرامی کا نام مرتضیٰ حسن تھا جو ملازمت کے باعث گوالیار (مدھیہ پردیش) میں قیام پذیر تھے۔ لہٰذا ندا فاضلی کی تعلیم وتربیت گوالیار میں ہوئی۔ ان کے والدین 62-1961 میں (جب ندا ایم۔اے سال اوّل میں تھے) پاکستان ہجرت کرگئے، جس سے ان پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا مگر انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور زندگی گزارنے کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ انھوں نے روزی روٹی کی تلاش میں ہندوستان کے کئی صوبوں کا سفر کیا اور 1964 میں ممبئی چلے گئے اور وہاں عارضی طور پر ریڈیو، اخبارات، پوسٹ آفس وغیرہ مختلف ادارات میں ملازمت کرتے رہے۔ اس کے بعد وہ فلمی دنیا سے جڑ گئے اور مشاعروں میں بھی جانے لگے۔ فلمی دنیا کا سفر آسان نہیں تھا، اس میدان میں کافی جدوجہد کے بعد انھیں کار جیتھ وانی کی تین فلموں کا آفر ملا۔ وہ فلمیں تھیں ''شاید، کنھیا اور ہرجائی''۔ اس طرح بڑی مشکل سے ان کی روزی روٹی کا مسئلہ حل ہوا، پھر وہ رفتہ رفتہ ترقی کی طرف گامزن ہوئے۔

ندا فاضلی کو شاعری وراثت میں ملی تھی۔ ان کے گھر کا ماحول بہت مہذب اور ادبی تھا، جس کا اثر ان کی ذات پر پڑنا لازمی تھا۔ چونکہ بٹوارے کا کرب انھوں نے خود بھگتا تھا اور اپنے گھر، خاندان کو کھویا تھا اس لیے اس کا درد بھی ان کی ذات کا حصہ بن گیا، جسے ان کی شاعری میں جابجا محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ان کی پہلی تخلیقی کاوش ''سندرتا'' کے عنوان سے رسالہ ''سریتا'' (اردو ایڈیشن) میں ستمبر 1959 کو شائع ہوئی تھی۔[2] اس نظم کا پہلا اور آخری شعر بطور نمونہ دیکھیے:

میں نے پہلی بار تجھے جب دیکھا تھا
مجھ کو اب تک یاد ہے من میں سوچا تھا (نظم: سندرتا)

سائے کو چھونا سائے کو کھونا ہے
سندرتا کا پیار جنم کا رونا ہے

مندرجہ بالا نظم کے متعلق ندا فاضلی نے اپنی خودنوشت ''دیواروں کے بیچ'' کے صفحہ نمبر 82 پر اس نظم کے متعلق لکھا ہے کہ ان کی یہ نظم رسالہ ''سریتا'' کے اردو ایڈیشن کے پہلے شمارے میں شائع ہوئی تھی، جب کہ یہ نظم چوتھے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ خیر سہواً ایسا ہوا ہوگا۔

ندا فاضلی زمانی اعتبار سے جدیدیت سے تعلق رکھتے ہیں لیکن مزاجاً وہ کسی عہد یا کسی مخصوص رجحان کے پیرو نہیں ہیں بلکہ ان کی تخلیق ان کے حالات، تجربات اور مشاہدات کا نتیجہ ہے۔ ان کے یہاں مختلف قسم کے اشعار کی جھلک دکھائی دیتی ہے، کیوں کہ یہ ان اوقات، حالات، کیفیات اور جدوجہد سے عبارت ہیں، جسے انھوں نے کسی طور گزارا ہے یعنی ان کی شاعری ان کے ذاتی مشاہدات و تجربات کی دین ہے۔ اور اسی کو وہ اپنے اشعار کے قالب میں ڈھال کر پیش کرتے ہیں۔ ان کی شاعری کا بغور مطالعہ کرنے پر ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ انھیں شاعری کرتے ہوئے مختلف ذاتی کیفیات کا کرب جھیلنا پڑا ہے۔ شاعری کرتے ہوئے وہ کبھی جذباتی ہو جاتے ہیں، کبھی سراپا غم کی تصویر بن جاتے ہیں، کبھی ناموافق حالات میں ہوشیار بن جاتے ہیں، کبھی زمانے سے ٹکرانے کا حوصلہ دکھاتے ہیں، کبھی اخلاقی قدروں کو مذہب سے بھی بلند مانتے ہیں، کبھی اپنوں کی جدائی میں یاسیت و قنوطیت کے بحر میں ہچکولے کھانے لگتے ہیں، کبھی اقدار رفتہ کے ساتھ چلنے کا مشورہ دیتے ہیں تو کبھی اقدار جدیدہ سے گریز کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ غرض ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے موضوع کا انتخاب بڑی باریکی سے کیا ہے۔

جدیدیت کے اکثر شعرا اس راستے پر رواں دواں ہوتے ہیں جس عہد سے ان کا تعلق ہوتا ہے مگر ندا فاضلی نے اس طرز کو مسترد کرتے ہوئے اپنے کلام کو اندرونی تخلیقی اپج کے مطابق تشکیل کیا۔ ان کے چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ کیجیے۔

وہ صوفی کا قول ہو یا پنڈت کا گیان
جتنا بیتے آپ پر اتنا ہی سچ مان

ہر کشتی کا اپنا تجربہ ہوتا ہے دریا میں
سفر میں روز ہی منجھدھار ہو ایسا نہیں ہوتا

جو کتابوں میں ہے وہ سب کا ہے
تو بتا تیرا تجربہ کیا ہے

جب بھی دیکھو اسے اپنی ہی نظر سے دیکھو
کوئی کچھ بھی کہے تم اپنے خیالات لکھو

اچھی صورت والے سارے پتھر دل ہوں ممکن ہے
ہم تو اس دن رائے دیں گے جس دن دھوکا کھائیں گے

وارث علوی کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ:

''ندا کسی اسلوب کا اسیر نہیں اور وہ ایک نئی زمین میں اپنی جڑیں تلاش کرنے میں کامیاب ہے''۔ 3

ان کی شاعری میں ضبط اور ٹھہراؤ پایا جاتا ہے ان کی شاعری تعمیری رجحانات کی حامل ہے۔ انھوں نے شاعری کی شروعات اس وقت کی جب تقسیم ہند کا ہولناک واقعہ گزر چکا تھا اور پوری طرح بکھرے اور ٹوٹے لوگ دھیرے دھیرے ابھرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر آج بھی ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں گزشتہ حالات اور احساس کی شدت محسوس ہوتی ہے، اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ندا فاضلی گہرا سیاسی اور سماجی شعور رکھتے تھے۔ ان میں غنائیت کی وہی مترنم بحریں ہیں، جن میں عشق کی گرمی ہے اور سیاہ شب کی تپش ہے۔ ندا فاضلی کے ملک کے تئیں کیا افکار و خیالات تھے انھیں اس شعر میں ملاحظہ کیجیے۔

حکومتوں کو بدلنا تو کچھ محال نہیں
حکومتیں جو بدلتا ہے وہ سماج بھی ہو

درختوں کو ہرا رکھنے کے ذمہ دار تھے دونوں
جو سچ پوچھو برابر کے ہیں مجرم باغباں اور ہم

ندا فاضلی کے سلسلے میں سلیم محی الدین صاحب نے بجا فرمایا ہے کہ:

''کسی قسم کی نظریاتی شدت پسندی کے بغیر ندا کی شاعری انسانی فطرت، اس کے منفی و مثبت پہلو، فرد کی تنہائی، ارباب سیاست کی عیاری، مذہب کے نام تجارت، فرقہ واریت کی تباہ کاری اور دم توڑتی ہوئی انسانیت کا نوحہ ہے۔'' 4

ندا فاضلی کے اشعار میں اخلاق، خلوص اور دردمندی جھلکتی ہے۔ ان کی شاعری انسانی رشتوں ی کی سچائی کی جیتی جاگتی مثال ہے۔ انسان کی خصلتِ معصومیت ان کے کلام کی جان ہے۔ ندا اس کی کھوج میں دیر و حرم، تاریک گلیوں، ساحلوں اور ماہتاب و کوکب تک پہنچتے ہیں اور اس کے

برعکس پروردگار کو آسمانی جھنڈ میں ڈھونڈنے کے بجائے زمین پر موجود انسانی رشتوں میں تلاش کرتے ہیں۔ ان کی روح کی گہرائیوں میں میرو غالب کا فکری نظام اور کبیر کے لہجے کی مٹھاس پیوست تھی۔ ان کا اسلوب اچھوتا اور فن پختہ تھا، جس کی وجہ سے وہ بہ آسانی ان موضوعات کو اپنے لفظوں میں پرولیتے ہیں، مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھیے۔

گھر سے مسجد ہے بہت دور چلو یوں کر لیں
کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسایا جائے

جانے والوں سے رابطہ رکھنا
دوستوں! رسم فاتحہ رکھنا

ندا فاضلی زندگی کو کھل کر جینے میں یقین رکھتے تھے۔ ان کی ہمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جیب میں کھانے کے لیے پیسے نہیں لیکن مزاجاً خوش حال نظر آتے۔ ہزار مصیبتیں ہونے کے باوجود زندگی کی مشکلات کو سرسری طور پر لیتے، وہ قسمت کی بجائے عمل پر یقین رکھتے۔ ان کا نظریہ تھا کہ کتابی علم کی اپنی اہمیت ہوتی ہے لیکن جو علم زندگی کے تجربے سے حاصل ہوتا ہے وہ حقیقت سے بالکل قریب ہوتا ہے۔ اپنے اسی ایمان کی بدولت وہ اس طرح کے اشعار خلق کر پاتے ہیں کہ۔

دھوپ میں نکلو گھٹاؤں میں نہا کر دیکھو
زندگی کیا ہے کتابوں کو ہٹا کر دیکھو

داناؤں کی بات نہ مانی کام آئی نادانی ہی
سنا ہوا کو، پڑھا ندی کو، موسم کو استاد کیا

بچوں کے چھوٹے ہاتھوں کو چاند ستارے چھونے دو
چار کتابیں پڑھ کر یہ بھی ہم جیسے ہو جائیں گے

ندا فاضلی کے کلام میں کہیں نہ کہیں اپنوں سے جدائی کا کرب بارہا دکھائی دیتا ہے مگر دوسری طرف ان کا خیال ہے کہ یہی درد وغم کی ٹیس شعری جمالیات کی تخلیق میں رہبری کرتی ہے۔ کبھی کبھی انسان زندگی میں خاندانی جدائی کی کشمکش میں اتنا الجھ جاتا ہے کہ اسے یاد ہی نہیں رہتا کہ اس نے کیا پایا اور کیا کھویا۔ اس درد کو ندا فاضلی کے درج ذیل اشعار میں محسوس کیجیے

ماں کی تصویر باپ کی تحریر
اپنی میراث میں لکھو صاحب
جو کھو جاتا ہے مل کر زندگی میں
غزل نام ہے اس کا شاعری میں

ندا فاضلی نے اپنی شاعری میں ان ساری الجھنوں، بے چینیوں، انفرادی اور اجتماعی کامیابیوں اور ناکامیابیوں کو جگہ دی ہے جن سے اس عہد کے شاعروں اور ادیبوں نے اپنے شعور کی محفلیں آراستہ کیں۔ زندگی کے مسائل کو سمجھنے اور ان کا اظہار کرنے میں طریق کار کا اختلاف ہی شاعروں کی انفرادیت کا پتہ دیتا ہے، لہذا اس پر نگاہ رکھ کر ہی ہم شاعر کے مطمح نظر کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ ندا فاضلی کی شاعرانہ طبیعت کی بنیادی خصوصیت تغزل ہے۔ چونکہ غزل رومانی یاسیت کا بہترین پیرایہ اظہار ہے۔ ان کی غزلوں میں ابتداء ہی سے ایک خاص قسم کا کیف غم نظر آتا ہے مگر ان کے غم اور پریشانی میں بھی امید کی کرن جھلکتی رہتی ہے اور وہ ہمیشہ پرسکون خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ بطور مثال یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

کیا ہوا جو اٹھ گیا سارے طبیبوں کا مطب
درد کے اندر ہے پوشیدہ ہے درماں غم نہ کھا

اس کو تو پایا نہیں ڈھونڈا کیے
ہم سے جتنا ہو سکا وہ کر چلے

میداں کی ہار جیت تو قسمت کی بات ہے
ٹوٹی ہے کس کے ہاتھ میں تلوار دیکھنا

خوشی کلی نہ بنی غم میں بے کلی نہ رہی
کبھی کبھی تو کہیں کوئی روشنی نہ رہی

ندا فاضلی کے کلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں گاؤں کے لیے محبت کا ایک الگ احساس جھلکتا ہے۔ گاؤں چھوٹنے کے بعد بھی وہاں کی ہر شے سے ان کا روحانی رشتہ ہے جیسے نیم کا گھنا پیڑ، بے فکر کھیلتے بچے، خالی سنسان سڑکیں، کنویں سے پانی بھرتی چنچل دوشیزائیں، لوگوں کی وہ معصومیت جو دوسروں کے درد سے تڑپ جایا کرتی تھی اور گاؤں کی سیدھی سادھی زندگی جیسے خالص اور سچے جذبات کو ندا فاضلی ممبئی جیسی تجارتی بستی میں ہر آسودگی کے باوجود بھی بھولنے سے قاصر ہیں۔ اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنے شعری مجموعوں اور کلیات کو گاؤں میں رہنے والے بال بچوں اور خاندان کی طرف منسوب کیا ہے۔ اس نئی تہذیب نے انسانی زندگی کے سامنے اس قدر مسائل کھڑے کر دیے ہیں کہ وہ مشین کی طرح کام کرنے پر مجبور ہے، اتنا ہی نہیں بلکہ وہ اپنے گاؤں، کھیت کھلیانوں، دوستوں، رشتہ داروں کو چھوڑ کر دور اجنبی شہروں

کارخ کرتا ہے۔ جہاں ہر طور پر غبار ہی غبار ہے، ایک طرف چمنیوں سے نکلنے والے دھویں نے پوری فضا کو آلودہ کر رکھا ہے تو دوسری طرف داخلی نقطہ نظر سے شہر میں چاروں سمت مکاری، دغابازی اور ریاکاری کا بول بالا ہے۔ اس ضمن میں ندا فاضلی کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

سنا ہے اپنے گاؤں میں رہا نہ اب وہ نیم
جس کے آگے ماند تھے سارے وید حکیم

اچھی نہیں ہے شہر کے رستوں سے دوستی
آنگن میں پھیل جائے نہ بازار دیکھنا

دعا سلام ضروری ہے شہر والوں سے
مگر اکیلے میں اپنا بھی احترام کرو

ندا فاضلی کے کلام میں حوصلہ، ہمت اور جنون جیسے عناصر پائے جاتے ہیں۔ ان کے اشعار مصیبت اور پریشانی سے لڑنے کا حوصلہ دیتے ہیں۔ زندگی میں سب کچھ ختم ہونے کے بعد بھی اپنے مقصد میں مسلسل جلتے رہنے کا سبق سکھاتے ہیں۔ وہ خود بھی اپنے والدین کے پاکستان ہجرت کر جانے کے بعد ہندوستان میں تن تنہا جدوجہد کرتے رہے اور کبھی ہمت نہیں ہارے، جس کی جھلک ان کے کلام میں صاف دکھائی دیتی ہے۔ ناموافق حالات کو سازگار بنانا اپنی جگہ لیکن کوشش میں کوتاہی کرنا مردہ انسان کی علامت ہے۔ ندا کا خیال ہے کہ حوصلوں سے انسان نے کیا نہیں کر دکھایا ہے؛ پہاڑوں کے درمیان سے راستے نکال لیے، سمندر کے سینے میں شگاف کر اپنے لیے گزرگاہیں بنالیں، آسمان کو مسخر کر لیا، شیطانی اور طاغوتی طاقتوں کو شکست دے ڈالی۔ مگر یہ کارہائے نمایاں قصۂ ماضی بن چکے ہیں۔ عہدِ حاضر کی نسلیں غفلت میں پڑی ہوئی ہیں، لیکن اگر یہ بیدار ہو جائیں تو عین ممکن ہے کہ حالات بدل جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ ندا فاضلی موجودہ نسل کو اپنے کلام سے بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں، دو اشعار نمونے کے طور پر پیش کرتی ہوں، ملاحظہ کیجیے۔

خدا کے ہاتھ میں مت سونپ سارے کاموں کو
بدلتے وقت پہ کچھ اپنا اختیار بھی رکھ

کوشش بھی کر امید بھی رکھ، اور راستہ بھی چن
پھر اس کے بعد تھوڑا مقدر تلاش کر

ندا فاضلی کے کلام میں ترقی پسندی بھی نظر آتی ہے۔ ترقی پسند ادیبوں کی طرح ندا فاضلی بھی ادب برائے زندگی والے نظریے کے حامی تھے۔ ان کی شاعری ہمیں مظلوموں کی حمایت کرنے، ظالموں کے خلاف آواز اٹھانے، سخت محنت کرنے اور مزدوروں سے ہمدردی کا اظہار کرنے کا درس دیتی ہے۔ اشعار دیکھیے۔

ہر ایک گھر میں دیا بھی جلے اناج بھی ہو
اگر نہ ہو کہیں ایسا تو احتجاج بھی ہو

انقلابوں کا کوئی وقت نہ تاریخ نہ دن
جب بھی پانی کسی سیلاب کا سر سے گزرا

ندا فاضلی کے کلام میں جدیدیت کا عکس بھی جھلکتا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد ملک میں ہوئی خوں ریزیوں اور سفاکیوں نے لوگوں کے دلوں میں عدم تحفظ کا احساس پیدا کر دیا تھا۔ ملک کی عوام وجود کے کرب سے گزرنے لگی اور اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے لگی۔ وجود کا یہ مسئلہ اور تنہائی کا ایسا احساس جدید شعرا کے یہاں عموماً دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان موضوعات سے ندا فاضلی کا کلام بھی اچھوتا نہیں رہا ہے۔ وجود کا کرب، تنہائی، بے حسی اور انسانیت کی پامالی سے ان کا کلام بھرا پڑا ہے۔ دو اشعار دیکھیں

ہر طرف ہر جگہ بے شمار آدمی
پھر بھی تنہائیوں کا شکار آدمی

ایک محفل میں کئی محفلیں ہوتی ہیں شریک
جس کو بھی پاس سے دیکھو گے اکیلا ہوگا

ندا فاضلی جدیدیت کی تنہائی کے متعلق اپنے شعری مجموعہ ''سب کا ہے ماہتاب'' میں خود لکھتے ہیں کہ:

''ایک فرد اور معاشرہ کی تنہا لڑائی مہابھارت کے مماثل ہے۔ اس میں فرد کی بیچارگی بھی ہے، سیاست کا دباؤ بھی ہے، حالات کا الاؤ بھی ہے اور ان کے ساتھ زندگی گزارنے کا تناؤ بھی ہے۔'' [5]

ندا فاضلی اس ریاکار زمانے میں بڑی ہوشمندی سے زندگی جیسے سفر کو طے کرنے کا مشورہ دیتے ہیں اور زندگی میں کامیاب ہونے کا یہی طرز بتاتے ہیں۔ اس دور میں اگر ترقی کرنی ہے تو بڑی سمجھداری سے آگے بڑھنا ہوگا۔ مشورہ کی صورت میں کہے ہوئے ان کے کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

بات کم کیجیے ذہانت کو چھپاتے رہیے
اجنبی شہر ہے یاں دوست بناتے رہیے

دشمنی لاکھ سہی ختم نہ کیجیے رشتہ
دل ملے یا نہ ملے ہاتھ ملاتے رہیے

ندا فاضلی کے نزدیک عشق کی بڑی اہمیت تھی ۔ وہ وقت گزاری کے لیے کسی سے دل لگانے کے حامی نہیں تھے ۔ ان کے خیال میں عشق پوری زندگی گزارنے کا سرچشمہ ہونا چاہیے ۔ عشق کا تعلق روح سے ہوتا ہے، یہ محض وقت گزاری کا وسیلہ نہیں ہوتا۔ عشق کے متعلق ندا فاضلی کے خیالات ملاحظہ ہو۔

کچھ طبیعت ہی ملی تھی ایسی چین سے جینے کی صورت نہ ہوئی
جس کو چاہا اسے اپنا نہ سکے جو ملا اس سے محبت نہ ہوئی

وہ ایک ہی چہرہ تو نہیں سارے جہاں میں
جو دور ہے وہ دل سے اتر کیوں نہیں جاتا

مجازی عشق کے ساتھ عشق حقیقی کی جھلک بھی ان کے کلام میں دکھائی دیتی ہے۔ جیسے:

خدا کے حکم سے شیطان بھی ہے آدم بھی
وہ اپنا کام کرے گا تم اپنا کام کرو

خدا تو مالک و مختار ہے کہیں بھی رہے
کبھی بشر میں کبھی جانور میں رہتا ہے

وقت کا کام مسلسل چلنا ہوتا ہے۔ انسان اپنے اخلاق اور عمل سے بڑا بنتا ہے نہ کہ حسب ونسب سے۔ کسی امیر یا اشرافیہ خاندان سے ہونا قسمت کی بات ہے، اس میں اس کی صلاحیت اور کمالات کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ والدین سے ملی دولت اور شہرت پل بھر کی ہوتی ہے لیکن خود کی محنت سے بنایا گیا نام تاعمر باقی رہتا ہے۔ انسانیت کا تقاضا یہ ہے کہ کسی بھی چیز کی فراوانی اسے غرور میں مبتلا نہ کرے، کیوں کہ وقت کو کروٹ بدلتے دیر نہیں لگتی۔ اسی لیے ندا فاضلی کہتے ہیں۔

ایک سا رہتا نہیں وقت ہمیشہ سب کا
کل حویلی تھی جہاں آج ہے رستہ سب کا

اردو میں ان کے کل سات شعری مجموعے ہیں، جو شائع ہو چکے ہیں 'لفظوں کا پل' 1969، 'مورناچ' 1978، 'آنکھ اور خواب کے درمیان' 1986 ، 'کھویا ہوا سا کچھ' 1996، 'شہر میرے ساتھ چل تو' 2004، 'زندگی کی طرف' 2007، 'سب کا ہے ماہتاب' 204 ۔ ان کا کلیات ''شہر میں گاؤں'' 2012 میں شائع ہوا۔

آج سے کوئی چھ برس قبل جدید دور کا یہ شاعر اپنی عمر طبعی گزار کر 78 برس کی عمر میں 8 فروری 216 کو ممبئی میں انتقال کر گیا۔ ندا فاضلی کے ساتھ اردو شاعری کے ایک دور کا خاتمہ ہو گیا۔ انھیں متعدد ایوارڈ و انعامات سے نوازا گیا، جس میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، غالب ایوارڈ، خسرو ایوارڈ، میر تقی میر انعام ، اردو سنگم انعام، پدم شری ایوارڈ، نیشنل ہارمنی ایوارڈ، بہترین نغمہ نگار اسٹار اسکرین ایوارڈ، بالی ووڈ انعام، جے پال انعام، روٹری ایکسی لینٹ انعام، شکھر سمان، اسکرین انعام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مذکورہ بالا مباحث کی روشنی میں یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ندا فاضلی کی شاعری ان کے تجربات اور مشاہدات پر مبنی ہے اور ان کا طرز ان کے ہم عصر شعرا سے بالکل منفرد ہے۔ اپنی انفرادی طرز کی ہی بدولت انھوں نے اردو شاعری کی دنیا میں نہ صرف اپنی پہچان بنائی بلکہ ایک بلندی پر فائز ہو سکے اور مجھے امید ہے کہ ان کی یہی صفت اردو ادب میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رکھے گی۔

حواشی:

1 ہندوستانی ادب کے معمار ندا فاضلی ، اسیم کاویانی، ساہتیہ اکادمی دہلی، 2018 (اشاعت اول)، ص:10

2 سندرتا: از ندا فاضلی، مشمولہ: سریتا (اردو ایڈیشن)، دلی پریس جھنڈے والا اسٹیٹ نئی دہلی، شمارہ:4، 959، ص:89

3 ندا کسی اسلوب کے اسیر نہیں نئی زمین تلاشنے میں کامیاب: از شاہ نواز قریشی، مشمولہ: نیا دور لکھنو، شمارہ:2، 2018، ص:53

4 ایضاً ص:53

5 سب کا ہے ماہتاب (شعری مجموعہ)، ندا فاضلی ، عرشیہ پبلی کیشنز دہلی، 2014، ص:19

□□□

Nusrat Jahan
Research Scholar
Dept. of Urdu
University Of Allahabad
Prayagraj-211002 (U.P)
Mob: 7905161330

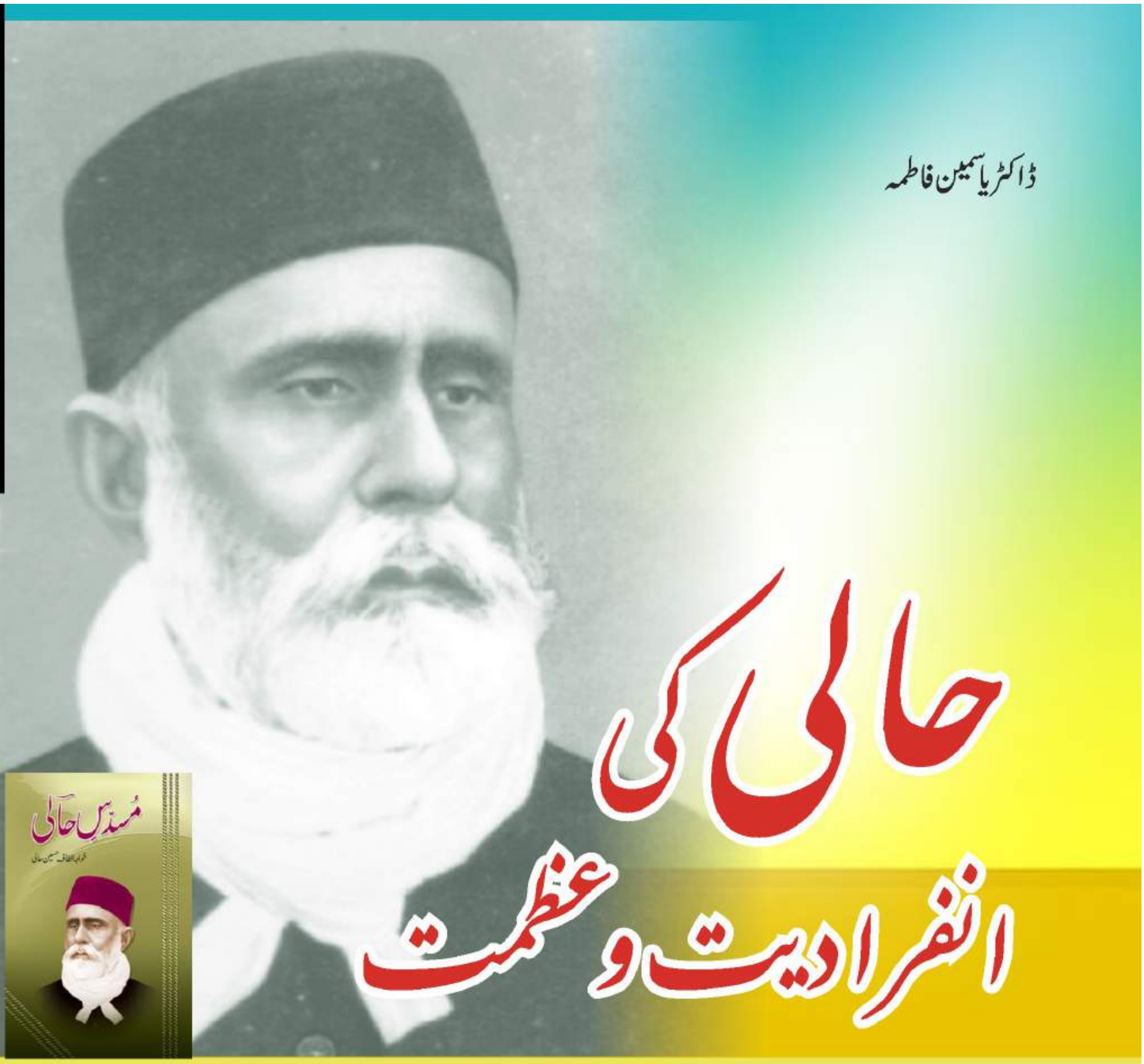

ڈاکٹر یاسمین فاطمہ

حالی کی انفرادیت و عظمت

حالی ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ اردو ادب میں بیک وقت فن سوانح نگاری کے مجدد اور فن تنقید نگاری کے اصول وضوابط کے کامیاب مرتب کہلائے ساتھ ہی اپنے تیئں ایک سنجیدہ اور بردبار شاعر بھی رہے۔ سنجیدہ اور بردبار اس معنی میں کہ ان کا رویہ ورجحان شاعری کے تعلق سے انفرادی قوت وبصیرت کا حامل رہا۔ وہ شاعری کی اہمیت، اس کی افادیت کے تناظر میں تصور کرتے ہیں اور اسے قوم وسماج کی فلاح سے منسوب قرار دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ مقصدی اور افادی شاعری کے قائل ہیں۔ ان کا خیال اور عقیدہ ہے کہ شعر گوئی کے عمل میں متعلقہ عہد کے حقائق ومسائل کو اہمیت دی جائے۔ شعری تخلیق میں ان عوامل وامور کا اظہار ہو اور نوعیت و حقیقت کی سطح پر فکری تاثر کو پیش کرے جس سے کہ عملی اور تعمیری رجحان کو فروغ ملے۔ اس طرح فرد و جماعت اصلاح وتجدید کے مراحل طے کریں گے اور بہتری وکامیابی کی منزل سے ہمکنار ہوسکیں گے اور جب ان کا یہ عقیدہ اور رویہ شعور کی بالیدگی کو پہنچتا ہے تو وہ متعلقہ عہد کی شاعری کے بابت اپنی بے زاری اور ناپسندیدگی کا اظہار بھی برملا کرتے ہیں۔ مثلاً

زمانے کا نیا ٹھاٹھ دیکھ کر پرانی شاعری سے جی
سیر ہوگیا تھا اور جھوٹے ڈھکوسلے باندھنے سے
شرم آنے لگی تھی۔۔۔۔

(مسدس حالی، مرتب ڈاکٹر اشفاق حسین صفحہ 14)

''زمانے کا نیا ٹھاٹھ'' یعنی یقینی طور پر حالی کے نزدیک اس عہد کے وہ حالات اور تقاضے تھے جن کی نوعیت وحقیقت قدیم وجدید اقدار کے باہمی کشمکش کی متحمل تھی اور ان سے عوام بالخصوص مسلم افراد کی ذہنی ہم آہنگی اور دلی وابستگی گریز واحتجاج کی مظہر تھی۔ عموماً زندگی اپنے حال میں مست اور مستقبل سے بے خبر یا تو 'آہ' یا پھر 'واہ' کی کیفیت سے تعبیر تھی۔ غالباً 'آہ' کی صورت افراد کی بے حسی اور قناعت پسندی کی متعارف تھی اور 'واہ' کی

متحمل زندگی حقیقت سے پرے ظاہری نمود ونمائش کی آئینہ دار تھی۔طرز زندگی کے یہی دو رنگ عام طور سے اس عہد کی شاعری سے بھی معلوم ہوتے ہیں۔اس قسم کی شاعری کچھ معنوں میں شاعر کے ذہنی وقلبی تسکین کے حصول کا باعث تھی اور سماجی تنقیدی بصیرت سے عموماً نابلد تھی۔اور کم وبیش رسمی وروایتی انداز ومزاج کی دلدادہ تھی۔گو عہد حاضر کی شاعری بھی اکثر اس حقیقت سے مستثنیٰ نہیں ہے۔عموماً ظاہری حسن کے تعریفی امور اور والہانہ عشقیہ جذبات ومعاملات شعراء کی توجہ ودلچسپی کا مرکز ہوتے ہیں اور اس تعلق سے پیرایۂ اظہار کو دلکش وخارجی طور پر پراثر بنائے جانے پر زور دیتے ہیں۔اس لیے لفظی ومعنوی صنعتیں،تشبیہات واستعارات وغیرہ فنی وسائل خصوصی لحاظ سے ملتزم کیے جاتے تھے۔مبالغہ آمیزی اور تخیل کی رنگینی کا عمل بھی کسی حد تک راہ پا جاتا ہے،غرض کہ اس روایت وانداز کی شاعری کو تقریباً ہر عہد کے افراد کو وقتی ولمحاتی طور پر مطمئن یا دوسرے لفظوں میں محظوظ تو کرتی ہے مگر شاعری کے ذریعے محض مطمئن ولطف اندوز ہونا یا پھر کرانا،ناکافی ہے۔ممکن ہے کہ اس قسم کی شاعری عام مذاق کو متوازن اور صحت مند بنادینے کے حوالے سے منفی حیثیت کی حامل ہو کیونکہ شاعری ہو یا پھر فنون لطیفہ کی کوئی بھی شاخ ہو مثلاً موسیقی اور مصوری ہی کیوں نہ ہو؟ محض تفریح طبع کا ذریعہ بہم نہیں ہے۔گو یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مصوری اور موسیقی کے توسط سے حلقۂ شائقین ایک قسم کی لذت اور ذہنی نا آسودگی کو محسوس ومحصول کرتا ہے۔مگر صرف لذت کوبی یا پھر ذہنی آسودگی کا حصول کسی حد تک غیر صحت مند ذوق وفطرت کی علامت ہوگا۔تاہم ان فنون سے دلچسپی ورغبت رکھنے والے شائقین میں بعض ایسے بھی واقع ہوں جو کم وبیش صورت میں ہی سہی،کسی قسم کے فلسفہ وپیغام کو روح کی گہرائی اور شعور کی پاکیزگی کے ساتھ محسوس بھی کرتے ہوں اور ممکن ہے کہ اپنی ذات وشخصیت کی تشکیل وتعمیر کے حوالے سے اہمیت بھی دیتے ہوں اور یہ اقدام عملی اس حلقے کے افراد کے اعلیٰ وصحت مند ذوق وذہانت کی امین خیال کی جاسکتی ہے۔لہٰذا اسی بات کو شاعری کے تعلق سے بھی اہم اور قابل اعتنا خیال کیا جاسکتا ہے۔اس کے پیش نظر اس کے افادی پہلوؤں کی نشان دہی وتائید دونوں ممکن ہے۔مزید برآں یہ کہ شعر گوئی کا عمل بھی ایک سماجی وتہذیبی عمل سے تعبیر ہے اور شاعر کے سماجی شعور وبصیرت کی آئینہ دار ہے۔سماجی شعور کے تحت جو وہ اپنے گرد وپیش کے حالات وماحول سے جن مسائل وعوامل کو اخذ کرتا ہے اور ان کے تعلق سے تجزیاتی بصیرت سے کام لیتے ہوئے کوئی حل یا طریقۂ کار کا مشورہ دیتا ہے وہ ممکن ہے کہ نوعیت ومقدار کی حد تک مفید اور کارآمد بھی واقع ہو۔اس طرح کی شاعرانہ کاوش سماجی اصلاح وبہبود کے عمل وحقائق کو مزید قوت وحرکت بخشنے میں معاون ہوسکتی ہے۔غالباً اس قسم کے خیال وعقیدے کو ملحوظ رکھتے ہوئے حالی یونان کے مشہور فلسفی افلاطون کے اس نظریۂ جمہور کے مخالف معلوم ہوتے ہیں جس کے تحت سلطنت کی پائیداری اور ترقی کے لیے تقریباً ہر پیشے وفن کے ماہرین کی اہمیت تو تسلیم کی گئی مگر شعرا کی اہمیت وفضیلت کو تسلیم کیے جانے کے سلسلے میں سرد مہری کا رویہ ونظریہ کارفرما رہا جب کہ حالی شعر گوئی کی قوت کو خدا کی دی ہوئی تمام قوتوں میں سے ایک خیال کرتے ہیں۔مگر ساتھ ہی اس کو مقتضائے فطرت کے موافق استعمال کیے جانے پر زور دیتے ہیں۔اس ضمن میں ان کا خیال ملاحظہ ہو:

پس جو شخص اس عطیۂ الٰہی کو مقتضائے فطرت کے موافق کام میں لائے گا ممکن نہیں کہ اس سے سوسائٹی کو کچھ نفع نہ پہنچے۔

(مقدمہ شعر وشاعری ایڈیشن ڈاکٹر وحید قریشی۔صفحہ۔83)

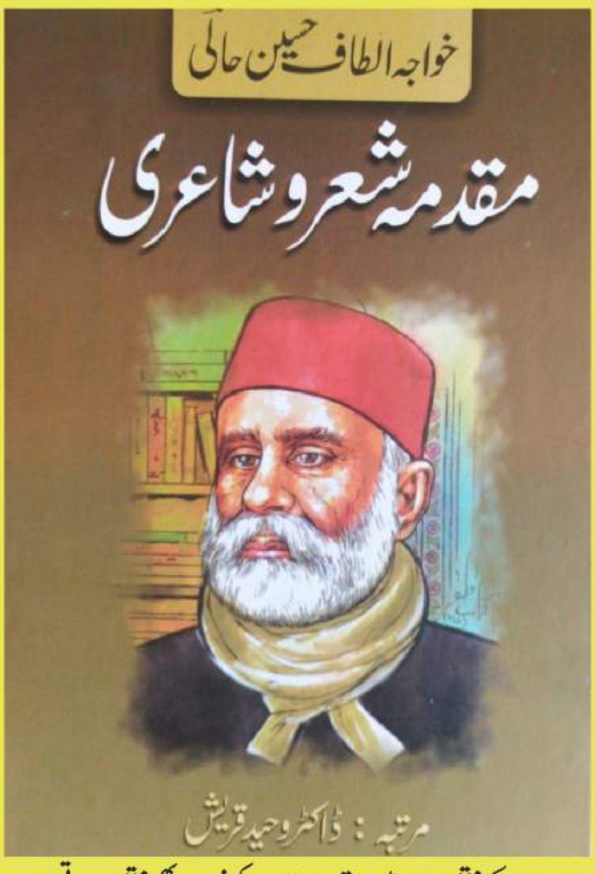

چونکہ مختلف عہد میں وقت وحالات کی نوعیت بھی مختلف ہوتی ہے۔اس کے تقاضے اور اس سے عہدہ برآ ہونے کے عقیدے اور طریقے بھی مختلف النوع ہوتے ہیں۔تغیر وتبدل تو فطرت کا خاص رنگ وعمل ہے۔جس کے زیر نتیجہ ہر عہد کے مسائل ومعاملات ایسے ہوتے ہیں جو ظاہراً یکساں

ہوتے ہوئے بھی انفرادی حیثیت رکھتے ہیں۔ان سے انسانی جبلت چاہ کر بھی چشم پوشی نہیں کرسکتی۔ اس اعتبار سے شاعر کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ متعلقہ عہد کے حقائق ومسائل سے بہرہ ور ہو اور اپنے تجربات ومشاہدے کے تناظر میں اس کے تاریک کن پہلوؤں کی نشاندہی کرے اور ایک نئی روشنی ونئی زندگی کی بات کرے۔ کم وبیش اس حقیقت کے پیش نظر حالی متاخرین یا دوسرے لفظوں میں معاصرین کو قدماء کی تقلید نہ کرنے کی تلقین کرتے ہیں اور'' نیچرل شاعری''جو'' لفظاً'' و''معناً''''عادات کے موافق'' ہوتے ہوئے زمانے کی سمت ورفتار سے مماثلت وموافقت رکھتی ہو۔یعنی کہ عصری تقاضوں کا احساس وادراک کراتی ہو جو یقینی طور پر سننے اور پڑھنے والے کی دلچسپی وتوجہ کا باعث ہوسکے۔اس طرح شاعری کو سماجی وقومی فلاح سے وابستہ تصور کرنے کا رویہ ورجحان حالی کی جدت پسند طبیعت کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ جدت پسندی کی یہ کیفیت حالی کو ایک دانشور کی حیثیت عطا کرتی ہے ان کی دانش وری کا اعتراف وارث علوی ان الفاظ میں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

> شعر وادب سے ان کی واقفیت ہے وہ اچھے اور برے شعر میں تمیز کرسکتے ہیں۔ وہ اچھی شاعری کی قوتوں کو جانتے ہیں اور بری شاعری کی کمزوریوں کو بھی پہچانتے ہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ ان کے زمانے میں شاعری مبتذل کیوں بنی اور یہ بھی جانتے ہیں کہ ابتذال سے باہر نکلنے کے راستے کون سے ہیں۔(حالی مقدمہ اور ہم ص18)

گو شاعری کے مبتذل ہونے کے اسباب اور ابتذال سے باہر نکلنے کے راستے کی نشان دہی کے عمل میں حالی کی دانش مندی اکثر جذباتیت اور شدت پسندی کی حد میں داخل ہوجاتی ہے۔اس حقیقت کے نقوش واثرات ان کی تخلیقی ونظری دونوں کاوشوں میں نمایاں ہے۔ مثلاً مقصدی وافادی رجحان اکثر موقع پر غالب ہیں اور حقیقی وفطری معاملات غیر معمولی اہمیت اختیار کرجاتے ہیں۔لفظی ومعنوی دونوں حیثیتوں سے تفہیم وترسیل کا معاملہ آسان اور عام فہم ہوتا ہے۔ نازک خیالی اور تخیل کی بلند پروازی یا پھر مبالغہ آمیزی سے قصداً یا اتفاقاً گریز کی کیفیت کا ہونا وغیرہ ایسے مختلف نکات و اموران سے (نظری وعملی) وابستہ ہیں جن کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیئے جانے سے فنی اقدار کے غیر اہم ہونے کا امکان ہوگا۔عملی شاعرانہ کاوش کے تعلق سے اس واقعیت کو مندرجہ ذیل اشعار کی روشنی میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے:

وہ امید کیا جس کی ہو انتہا
وہ وعدہ نہیں جو وفا ہوگیا

ہوئے رکتے رکتے دم آخر فنا
مرض بڑھتے بڑھتے دوا ہوگیا

اب وہ اگلا سا التفات نہیں
جس پہ بھولے تھے ہم وہ بات نہیں

غرض ایسے بہت سے غزلیہ اور نظمیہ اشعار ان کی تخلیقی کوششوں کی زینت ہیں جو معنوی نقطۂ نظر سے غیر معمولی حقیقت وواقعیت کی نشان دہی کرتے ہیں مگر شعری لب ولہجہ کہا جاسکتا ہے کہ نثری انداز فکر کا غماز ہے۔ کلیم الدین احمد اس تعلق سے لکھتے ہیں:

> نثریت اس قدر غالب ہے کہ اگر وزن کا لحاظ نہ کیا جائے تو ان کے شعروں کو سمجھنا مشکل ہوجائے۔

(اردو شاعری پر ایک نظر (دوئم) صفحہ 32)

حالی کے نظری وعملی رویوں میں در آنے والی نثری کیفیت یا پھر فنی خصوصیات کا فقدان عموماً ان کے اس رجحان کا رہین منت ہے جس میں مقصد کے حصول اور مفاد کا عقیدہ غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔شدت پسندی کا بے مہابہ عمل دنیائے تنقید میں ان اختلافات کو جنم دیتا ہے جس کی نشان دہی مختلف ناقدین نے اپنے علم وبصیرت کی نہج پر وقتاً فوقتاً کی ہے اور آئندہ بھی ہوتی رہے گی۔ تاہم ان کی شاعری کی اہمیت کو سماجی مفاد کے تناظر میں دیکھنے اور سمجھانے کی پیش رفت اپنے آپ میں بے مثال ہونے کے ساتھ ساتھ مثبت اہمیت کی حامل ہے۔ وارث علوی نے ڈاکٹر وحید قریشی کے اڈیشن ''مقدمہ شعر وشاعری'' میں پیش کردہ حالی کی تصویر کا جائزہ لیتے ہوئے بڑی معقول رائے پیش کی ہے:

> ''یہ ایک ایسے شفیق اور مہربان آدمی کی تصویر ہے جس نے زندگی میں کچھ دیکھا ہے کچھ سوچا ہے اس کے تجربات اور اس کے افکار شاید ہمارے لیے بصیرت افروز ثابت ہوں ہمیں اس کی بات سننی چاہیے۔''(حالی مقدمہ اور ہم، صفحہ 14)

□□□

Dr. Yasmeen Fatima
Assistant Professor
(Department of Urdu)
Mahila P. G. College
Bahraich. 271801 (U.P)
Mobile No:9956964863

سیدہ نسرین نقاش

جاگتی ہوئی آنکھوں کو کوئی خواب دکھا دے
تو عید سے پہلے مجھے مہتاب دکھا دے

لگتا ہے بہت دن سے وہ مصروف سخن ہے
اے دل اسے جا کر دل بیتاب دکھا دے

تو جس پہ میرے ساتھ بناتا تھا گھروندے
ایک بار وہی گاؤں کا تالاب دکھا دے

تشنہ ہے بہت دن سے زمینوں کا مقدر
بارش نہیں کرتا تو سیلاب دکھا دے

تتلی کے پروں کو کبھی نوید صبا کر
مرجھائے ہوئے پھولوں کو شاداب دکھا دے

اب کام نہیں کرتے انگوٹھی کے نگینے
نسرین کوئی گوہر نایاب دکھا دے

Syeda Nasreen Naqash
Editor 'Sada'
Urdu Monthly
Post Box No 849
G P O
Srinagar-190001 (Jammu & Kashmir)

عائشہ صدیقہ جے

نظم

عارضی ہے یہ دنیا۔۔

مرتبوں کی خواہش میں
ہم نے جی لیا برسوں
اور گھر گئے اک دن
نخوتوں کی سازش میں
وقت اک طویل اپنا
امتحان میں گزرا
جستجو کا ہر لمحہ
پُرتھکان ہے گزرا
منصبوں کی چاہت میں
دور تک چلے ہم بھی
علم و فن کی وادی میں
کچھ کما لیا لیکن
زندگی نے سمجھایا
عارضی ہے یہ دنیا۔۔
مرتبوں کی ہر خواہش
رنجشوں کا سودا ہے
بھیڑ ہے فریبوں کی
اور جھوٹے خوابوں کی
آخرش یہی نکتہ
ہم کو بھی سمجھ آیا
مال و زر، ہر اک دولت
صرف آنے جانے ہیں
عارضی ہے یہ دنیا۔۔

Ayesha Siddiqua J
163/ 72, N.S.K Street,
Old Pet,
Krishnagiri - 635 001 (Tamilnadu)

ہاجرہ خاتون

نظمیں

1۔صنف آہن

میں رد کر سکتی ہوں
تمھیں
تمھارے بنائے ہوئے
فرسودہ
رسم ورواجوں کی
بن سکتی ہوں مثال
بن سکتی ہوں
آہن
کیونکہ
تم اگر تم ہو
تو
میں بھی
میں ہوں

2۔احتیاط

مہرباں۔۔۔۔۔
تمھارے بھیجے ہوئے
تمام میسیجز
ان باکس میں
سوئے پڑے ہیں
میرے قدیم دکھ
انھیں چھونے سے ڈرتے ہیں
مبادا۔۔
کہیں
آنکھیں
پھر سے
نئے خواب نہ اوڑھ لیں
پھر بھلا
دل کو
باغی ہونے سے
کون روک سکتا ہے

Dr. Hajra Khatoon
1C Zuleikha Enclave,
Parastoli, Doranda,
Ranchi-834002 (Jharkhand)

کسک

ڈاکٹر نسرین بیگم علیگ

شاذیہ اور شاہ رخ ایک ہی کالج میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ شاذیہ عالیشان محلسرا کی مالک تھی۔ وہ دل میں ایک موہوم ارمانوں کی دنیا بسا کر مستقبل کا زریں خواب بن چکی تھی۔ اس کی زندگی ہزار ہا لطافتوں کا گنجینہ تھی۔ اس کی شاہ رخ سے دوستی کافی بڑھتی گئی۔ شاذیہ پڑھنے میں کافی ہوشیار تھی۔ شاذیہ کے والد اس شہر کے رئیس اور معززین شہر میں سے تھے۔ شہر کے لوگوں کی نظروں میں ان کی عزت و وقعت تھی۔ خوش نظمی، ہر دلعزیزی جس قدر انھیں حاصل تھی کم کسی کو نصیب ہوتی ہے۔ ہر یگانہ اور بیگانے کے ساتھ ان کی ہمدردی و غمگساری یکساں تھیں۔ مگر ان کا حقیقی بھائی یعنی شاذیہ کے چچا بشیر۔۔۔ جس کے ساتھ محبت برادرانہ کے علاوہ پرورش و پرداخت کا بھی تعلق تھا۔۔۔

لیکن انھیں کیا خبر تھی۔۔۔ کہ یہی بھائی ایک دن ان کے خون جگر کے لیے زہر کا پیالہ بن جائے گا اور تمام دولت کا مالک بن بیٹھے گا۔ اب شاذیہ جو کبھی ماں کی مامتا اور کنار عاطفت سے تنہا بہرہ ور اور باپ کی الفت آلود محبت آگیں نگاہوں کا واحد مرکز تھی۔ جس کے لیے ماں باپ کے دل میں سیکڑوں ارمان اور لاکھوں حوصلے پرورش پا رہے تھے اور جو خود بھی ہمہ دم ہزاروں خواہشات پیہم کی رنگین دنیا میں کھوئی ہوئی سی رہتی۔ وہ جو راحت و آرام کے ہر ممکن سازوسامان سے بڑی حد تک آسودہ تھی۔۔۔۔ آج اس کے پاس کچھ بھی نہیں۔۔۔۔

شاہ رخ کو تعلیم مکمل کرتے ہی نوکری مل گئی تھی۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی وہ شاہ رخ سے محبت کرتی تھی۔

اور شاہ رخ سے اپنی محبت کا اظہار بھی کر چکی تھی۔۔۔۔ شاہ رخ بھی اس سے اتنی ہی محبت کرتا تھا۔۔۔۔۔

اچانک اس کی زندگی میں یہ موڑ آئے گا، اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔۔۔۔۔ زندگی میں کب کیا ہو۔۔۔ کہا نہیں جا سکتا۔۔۔

سب کچھ ٹھیک چلتے چلتے اچانک کیا ہو، پتہ نہیں۔

زندگی قیمتی ہے۔۔۔۔ مگر زندگی کا سفر آسان نہیں ہوتا۔ امتحانات تو دینے پڑتے ہیں۔ امتحان کا نتیجہ کبھی کبھی دیر سے بھی آتا ہے۔ چچا کے اس رویے سے شاذیہ کی زندگی بدل گئی تھی۔ تنگ دستی کا سامنا تھا۔ مجبوراً شاذیہ کو نوکری کرنی پڑی۔

اس کے والد بھی بیحد کمزور ہو چکے تھے۔ اس غم نے انھیں وقت سے پہلے ہی بوڑھا کر دیا تھا۔ کچھ کام کرنا ان کے لیے مشکل تھا۔ اب تو بس شاذیہ کا ہی سہارا تھا۔

شاذیہ تنہا بے یار و مددگار اپنے کمرے میں بیٹھی کچھ سوچ رہی ہے۔ آنکھوں سے آنسوؤں کے گرم قطرے اس کے دامن پر گر رہے ہیں۔

اس وقت شاذیہ کے دلی جزبات کا حال کوئی اسی کے دل سے پوچھے۔

کبھی اپنی موجودہ تکلیف کا احساس کر کے بے اختیار بلبلا اٹھتی ہے۔۔۔اور کبھی حقیقی چچا اور چچی کے مظالم اور سرد مہری پر سر دھننے لگتی ہے۔ جنھوں نے اس کے والد کی جائداد پر غاصبانہ قبضہ کر کے اسے اس حال میں پہنچا دیا۔۔۔۔

شاذیہ کو وہ دن یاد آتے ہیں۔وہ ان دلخراش حقیقتوں پر سراپا یاس و حسرت بن جاتی اور اس کی موہوم فرضی و خیالی محفل نشاط و عشرت بھی درہم برہم ہو جاتی۔۔۔۔۔۔

شاذیہ کے اس حال کو دیکھ کر شاہ رخ کے گھر والے شادی کے لیے تیار نہیں تھے۔وقت بدل چکا تھا۔شاذیہ اور شاہ رخ کی محبت کو اب دولت کے پلڑے پر تولا جا رہا تھا۔

شاہ رخ کے اندر ابھی تھوڑی مروّت باقی تھی۔اس نے شاذیہ سے بہت سارے وعدے جو کیے تھے۔اس وقت اس کے دل میں کیا تھا اور زبان پر کچھ اور تھا جسے شاذیہ سمجھ نہ سکی تھی۔۔۔

شاہ رخ کی بھی نظر شاذیہ کی دولت پر تھی۔۔۔شاذیہ اس دولت کی واحد حقدار تھی۔تمام جائیداد اسی کی ہوتی۔اگر چچا غلط طریقے سے قبضہ نہ کرتے۔۔۔۔شاذیہ کے گھر والے کچھ سوچ کر شادی کے لیے تیار تو ہو گئے۔۔۔

بہر حال شاذیہ سے شاہ رخ کی شادی ہو گئی اور وہ رخصت ہو کر سسرال آ گئی۔۔۔۔

شاذیہ خوش تھی۔۔۔اپنی نئی زندگی کے سنہرے خواب کو سجوئے ہوئے۔۔۔

مگر کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سب کچھ الٹا ہو جاتا ہے،جس کا اسے اندازہ ہی نہیں ہوتا۔

اور۔۔۔انسان کی پوری زندگی ایک کسک کے ساتھ گزرتی ہے۔

چند دنوں کے بعد ہی شاذیہ کو بات بات پر طعنے ملنے شروع ہو گئے۔۔۔۔شاذیہ برداشت کرتی رہی جہاں اتنے غم اٹھائے،تھوڑا اور سہی۔

شاہ رخ کا بھائی شاہد بہت ہوشیار تھا۔وہ کسی طرح شاذیہ اور شاہ رخ کو گھر سے نکال دینا چاہتا تھا۔

شاہد کی بیوی بھی بہت تیز تھی۔۔۔۔روز کے طعنے سے شاذیہ تنگ آ چکی تھی۔شاذیہ طعنے سن کر بھی چپ رہتی۔یہ تو ہم لوگوں پر بوجھ بن گئی ہے۔۔۔۔ہم لوگوں نے سوچا تھا کہ بڑی دولت لے کر آئے گی۔ گھر میں چار چاند لگ جائیں گے۔

مگر یہاں تو الٹا ہی ہو گیا۔۔۔کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ساس اور نند کے یہ طعنے اسے روز سننے پڑتے۔

ان لوگوں نے دھیرے دھیرے شاہ رخ کے بھی کان بھرنے شروع کر دیے۔۔۔۔کیا دیکھا تھا۔

یہ تو خالی ہاتھ آ بیٹھی۔۔۔۔ہر روز اس طرح کی باتیں سن کر شاہ رخ کے دماغ میں بھی وہی باتیں گھومنے لگیں۔

اب شاہ رخ کا سلوک بھی شاذیہ کے ساتھ پہلے جیسا نہیں تھا۔گویا اب شاذیہ کی زندگی اور مشکل ہو گئی۔اور وہ غمزدہ رہنے لگی۔

کیونکہ اب اس کا شوہر بھی اس کا ہمدرد نہیں تھا۔

ایک روز شاہ رخ نے شاذیہ کو بہت الٹا سیدھا سنایا اور شاذیہ کو گھر سے نکل جانے کو کہا۔آخر کار انھیں تلخیوں کے بیچ شاہ رخ نے شاذیہ کو گھر سے نکال دیا۔۔

شاذیہ کیا کرتی وہ اپنے میکے آ گئی۔۔۔۔۔کچھ دنوں بعد شاذیہ کے نام سمن (summon) آیا کہ وہ اپنے سسرال سے بہت سارے زیورات اور کیش لے کر بھاگ آئی ہے۔سمن پڑھ کر شاذیہ کے بوڑھے والد اس غم کو برداشت نہ کر سکے۔

آخر شاذیہ کو چھوڑ کر اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔اب تو شاذیہ پر غم کا پہاڑ ہی ٹوٹ پڑا۔

شاذیہ ایسی زندگی سے تنگ آ چکی تھی۔ایسی زندگی جو سراپا مصیبت ہو،جو غم والم سے معمور اور رنج و آفات سے گھری ہوئی۔یہ صحیح ہے کہ مصیبت ہر انسان پر آتی ہے لیکن ہر مصیبت کے ساتھ کچھ حسرتیں اور ہر تلخی کی تہ میں ہلکی سی شیرینی بھی ضروری ہے۔یعنی دکھ ہو تو کم سے کم کوئی سکھ بھی ہو۔بے بسی ہو تو کسی کا سہارا بھی ہو۔۔۔مگر شاذیہ بے سہارا تھی۔

مجبوراً اسے عدالت کا سہارا لینا پڑا۔اسے اپنی صفائی میں تو کچھ کہنا ہی تھا۔مگر ان مشکلات کا سامنا وہ تنہا کر رہی تھی۔

مقدمہ لڑنے کے لیے روپیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

مگر اسے اب پورے دس گھنٹے کام کرنا پڑت اپنا اور مقدمے کا خرچ جو تھا۔اب وہ مقدمے میں وکیل کی فیس دے سکتی تھی۔دولت کی چمک کے آگے رشتے نظر ہی نہیں آتے۔۔۔۔

ظلم کی انتہا دیکھیے۔۔۔کہ شاذیہ کو اس کے میکے چلے جانے کے بعد شاہ رخ کو بھی گھر سے نکالنے کی سازشیں رچی جانے لگی۔

مجبور ہو کر شاہد کی تلخ باتیں سنتے سنتے شاہ رخ کو برداشت کرنا مشکل ہو گیا۔ہونا کیا تھا اور وہ بھی گھر چھوڑ کر چلا گیا۔۔۔۔اب وہ کرائے کے مکان میں رہنے لگا۔ادھر شاذیہ اپنے مائکے اور ادھر

شاہ رخ تنہا اپنی زندگی گزار رہا تھا۔۔۔۔آج مقدمے کی تاریخ تھی۔ شاہ رخ اور شاذیہ دونوں عدالت میں حاضر ہوئے۔۔۔

شاذیہ کے پاس روپے تھے اور عزت بھی۔ کیونکہ وہ خود سسرال چھوڑ کر نہیں آئی تھی بلکہ اسے وہاں سے بدنام کرکے نکالا گیا تھا۔اس بات سے محلے والے واقف تھے۔

آج شاہ رخ کے پاس کچھ نہیں تھا۔نہ عزت اور نہ سر چھپانے کے لیے چھت۔۔۔اسے اب احساس ہونے لگا کہ ہم نے شاذیہ کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ایک یتیم کا دل دکھایا ہے۔۔۔۔جس کی سزا ہمیں مل رہی ہے۔ناحق اسے گھر سے نکالا یہ بھی نہ سوچا کہ وہ کیا کرے گی۔تنہا اپنی زندگی کیسے گزارے گی۔عورت صبر کرسکتی ہے۔تنگ دستی میں زندگی گزار سکتی ہے مگر رسوائی کبھی برداشت نہیں کرسکتی۔۔۔۔

شاہ رخ کہتا ہے۔۔۔۔۔جج صاحب۔۔۔میں شاذیہ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔طلاق نہیں چاہتا۔۔اب۔۔۔میری زندگی میں کچھ بھی نہیں۔

شاذیہ تم میرے ساتھ چلو۔میں الگ رہوں گا۔وہ دولت وہ گھر انھیں ہی مبارک ہو۔۔۔شاذیہ خاموش تھی۔

جج صاحب نے کہا۔۔ہاں شاذیہ تم کیا چاہتی ہو؟

شاذیہ نے جواب دیا ۔۔۔ہاں جج صاحب میں اکیلے نہیں رہنا چاہتی۔میں سب کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔۔۔

میں سسرال سے اپنی مرضی سے نہیں آئی تھی۔۔۔مجھے وہاں سے الزام لگا کر نکالا گیا تھا۔۔۔جو سراسر بے بنیاد تھا۔

اس گھر میں جیسے شادی کرکے گئی تھی۔۔۔اسی عزت سے وہاں جانا چاہتی ہوں۔۔۔سب کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔

شاہ رخ بولا۔۔۔شاذیہ تم یہ کیا کہہ رہی ہو۔۔ہم اور تم اکیلے رہیں گے۔اور کوئی نہیں۔۔۔۔شاذیہ بولی۔۔نہیں میں اپنے والدین کی عزت کو کم نہیں کرنا چاہتی۔۔۔اب تو مجھے تکلیفوں کو برداشت کرنے کی عادت سی پڑ گئی ہے۔۔اب کوئی بات نہیں۔

سب ٹھیک ہوجائے گا۔حالات نے ہمیں ہر حال میں رہنا سکھا دیا ہے۔۔۔۔مجبوراً شاہ رخ کو شاذیہ کی بات ماننی پڑی۔کیونکہ اب وہ شاذیہ کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔وہ حیرت زدہ تھا اور دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ واقعیٔ شاذیہ کتنی نیک ہے۔

شاہ رخ کا سر شاذیہ کے سامنے جھکا ہوا تھا۔۔۔۔اور اس سوال کے بعد جج صاحب کو جواب مل چکا تھا۔ان کی قلم چل رہی تھی۔ وہ لکھ رہے تھے۔۔۔۔۔

جج صاحب بولے ۔۔۔۔۔۔شاذیہ۔۔تم نے ایک مثال قائم کردی۔اپنے والدین کی عزّت کا خیال رکھا۔جبکہ ایسا اب کم دیکھا جارہا ہے کہ لڑکی سب کے ساتھ جوائنٹ فیملی میں رہنا چاہتی ہو۔مگر یہ اچھی تعلیم و تربیت کی نشانی ہے۔جو تمھارے والدین نے تمھیں دی ہے۔آج کل تو ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر بسے بسائے گھر بکھر جاتے ہیں۔اور زندگی تڑپ تڑپ کر،گھٹ گھٹ کر زندگی گزارنی پڑتی ہے۔۔۔۔واقعی تم سمجھدار ہو۔ہمیں یقین ہے کہ تمھارے اس فیصلے سے لوگوں میں اچھا پیغام جائے گا اور اس طرح چھوٹی چھوٹی باتوں سے گھر ٹوٹنے سے بچ جائے گا۔

تم نے شاذیہ آج وہ مثال قائم کردی ہے۔

شاہ رخ بار بار شاذیہ کی طرف رحم طلب اور التجا خیز نگاہوں سے دیکھتا رہا۔شاذیہ کہہ رہی تھی کہ شاہ رخ جو کسک دل میں ہے۔۔۔

۔۔۔مگر بار بار اس کسک کا احساس دل کو تڑپاتا رہا۔۔۔۔

پھر بھی ہمیں یقین ہے کہ یہ درد دھیرے دھیرے ختم ہوجائے گا۔۔۔شاہ رخ کچھ بول نہ سکا۔اس کے پاس اب کہنے کو کچھ نہ تھا،،،

وہ شرمندہ تھا۔۔ ۔۔اور سر جھکائے ہوئے تھا۔۔اس فیصلے سے اس کے دل میں شاذیہ کی محبت ہی نہیں اور عزت بھی بڑھ گئی تھی۔

کاش ہم پہلے کیوں نہیں سمجھتے۔۔۔۔اگر پہلے ہم یہ سوچ لیں تو اس رسوائی سے بچ جائیں جس کا سامنا آج کر رہے ہیں۔زندگی تو بہت قیمتی ہے اور ملتی بھی ایک بار ہی ہے۔

اگر ہم رشتوں کی اہمیت کو نہیں سمجھتے تو ہم انسان کہاں؟

ہم میں اور جانوروں میں کیا فرق رہ جائے گا۔

کورٹ میں جو لوگ موجود تھے وہ اس فیصلے سے خوش تھے۔چلو جو بھی ہوا۔۔گھر اجڑنے سے تو بچ گیا۔

کسی شاعر نے ٹھیک ہی کہا ہے ۔

دل میں ایک درد کی کسک سی تھی
اب ہوئی اس کی انتہا معلوم

□□□

Dr. Nasreen Begam (Alig)
Head Dept. of Urdu
Baikunthi Devi Girls (P.G) College
Agra-282001 (U.P)
Mob: 9897673824

مبارک ہو!

بدر فاطمہ قاضی

"عائشہ مبارک ہو! آپ کو بیٹی ہوئی ہے۔"

ڈاکٹر نے آ کر عائشہ کو جب یہ خبر دی تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی مگر اگلے ہی پل اس کے چہرے سے خوشی جیسے غائب ہی ہو گئی۔ خوشی کی جگہ غم اور آنسو نے لے لی۔

عائشہ ایک متوسط خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نہیں تھی کیونکہ اس کے والد کو لڑکیوں کا زیادہ تعلیم حاصل کرنا پسند نہیں تھا، اس لیے مشکل سے بارھویں تک تعلیم حاصل کی۔ پھر ماں کے ساتھ گھر کے کاموں میں مصروف رہنے لگی۔ والد سے اپنی پڑھائی جاری رکھنے کے لیے بہت منت سماجت کی مگر اس کے والد بالکل تیار نہ ہوئے۔

کچھ دن بعد عائشہ کے لیے منصور کا رشتہ آ گیا۔ دونوں خاندان اس رشتے کے لیے راضی ہو گئے۔ منصور کی ایک کرانہ دوکان تھی۔ وہ اپنے کاروبار میں بہت ایماندار تھا۔ کبھی بھی غلط تول مول نہیں کرتا تھا اس کی وجہ سے کاروبار میں برکت تھی۔ دوسرے محلے کے لوگ بھی اسی سے سودا سلف لینے آتے تھے۔

عائشہ اور منصور شادی کے بعد خوش تھے۔ اللہ نے رحمت بھیجی یعنی اللہ نے انھیں پہلی اولاد بیٹی عطا کی۔ عائشہ بہت خوش تھی مگر منصور خوش نہیں تھا۔ مگر وہ اپنی ناراضگی کا اظہار بھی نہیں کر پا رہا تھا۔۔ عائشہ جب ہسپتال سے گھر آئی تو منصور کی ناراضگی یا اس کا اس کے ساتھ رویہ بھانپ لیا، پہلے تو وہ اس کی وجہ سمجھ نہیں پائی مگر کچھ دن بعد وہ معاملے کی تہہ تک پہنچ گئی کہ منصور بیٹی کی پیدائش سے مایوس ہے۔ وہ اسے سمجھانے لگی کہ

"بیٹا بیٹی دینا تو اللہ کی مرضی ہے اس میں کسی عورت کا اختیار نہیں ہے۔"

مگر منصور یہ سب کہاں سمجھنا چاہتا تھا۔ اسے تو بیٹے کی چاہ تھی۔ عائشہ نے اپنی بیٹی کا نام خدیجہ رکھا۔ منصور خدیجہ کو جب بھی دیکھتا ڈانٹنے لگتا تھا۔ خدیجہ بھی باپ کا رویہ محسوس کرنے لگی تھی۔ خدیجہ ماں سے پوچھتی کہ

"ابو! مجھے دوسرے بچوں کے ابو کی طرح پیار محبت کیوں نہیں کرتے؟"

مگر عائشہ اس کے چھوٹے سے ذہن میں باپ کے تعلق سے کوئی بھی بری بات نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ اس لیے اس کو سمجھاتی کہ

"کام زیادہ ہونے کی وجہ سے ابو ایسا کرتے ہوں گے، ورنہ وہ بھی آپ کو بہت چاہتے ہیں۔"

خدیجہ دھیرے دھیرے باپ سے دور ہونے لگی اور چھوٹی سی بچی کے ذہن نے باپ کی ناراضگی کی وجہ کو بھی بھانپ لیا۔۔۔

اللہ نے عائشہ کو 4 سال بعد پھر خوشی یعنی رحمت سے نوازا۔ اس بار بھی منصور کا رویہ ویسا ہی تھا۔ مگر عائشہ اللہ کی رحمت کو پھر سے پا کر بہت خوش تھی۔ اور ساتھ ہی منصور کو سمجھاتی بھی تھی۔ مگر منصور سمجھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

منصور کے گھر جب سے اللہ نے دو دو رحمتوں کو بھیجا اس کے کاروبار میں کافی ترقی ہونے لگی۔ جہاں وہ ایک دکان کا مالک تھا وہیں وہ اب تین دکانوں کا مالک بن گیا۔ عائشہ اس سے کہتی رہتی کہ

"دیکھو اللہ نے ہمارے گھر رحمت کو بھیجا، اس لیے آپ کے کاروبار میں اتنی ترقی ہو رہی ہے۔"

مگر ڈھیٹ منصور رحمت کو اپنی محنت کا نام دیتا رہتا۔ اپنی بیوی کو ڈانٹ کر چپ کروا دیتا تھا۔ مگر عائشہ ہر وقت اللہ کی شکر گزاری کرتی رہتی تھی۔ اللہ جب اپنی رحمتیں نازل کرنے لگتا ہے تو وہ بس کرتے ہی رہتا ہے، اللہ کی مصلحت انسان کیا جانے۔۔۔!

عائشہ کے یہاں پھر سے خوشی کی خبر آئی، اس بار منصور اٹھتے بیٹھتے، ہر وقت، ہر لمحہ، ہر گھڑی بس عائشہ سے کہتا رہتا

"اس بار مجھے لڑکا چاہیے، ورنہ میں دوسری شادی کر لوں گا۔!"

عائشہ اس کی باتوں سے بے خوف رہتی تھی کیونکہ اس نے اپنے سارے معاملے اللہ کے سپرد کیے ہوئے تھے۔

عائشہ کو جب ڈاکٹر نے آکر یہ خبر دی کہ اس کے یہاں لڑکی ہوئی ہے تو وہ بہت خوش ہوئی مگر خوف زدہ بھی تھی کہ اب منصور نہ جانے اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گا!

اس نے اپنے سر کو جھٹک کر خود کو حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار کر لیا۔

منصور کو جب یہ خبر ملی کہ عائشہ نے تیسری بیٹی کو جنم دیا ہے تو وہ ہسپتال گیا ہی نہیں۔ بیٹی کو دیکھنا تک گوارہ نہ کیا۔ عائشہ جیسے تیسے گھر آئی، مگر منصور نے اسے اور بیٹیوں کو گھر میں آنے سے روک دیا۔ عائشہ نے اس کو بہت سمجھایا۔ اللہ اور رسول کا واسطہ دیا تو بادل ناخواستہ منصور نے اس کو گھر میں رہنے کی اجازت دی۔ مگر اس سے زبردستی دوسری شادی کی اجازت لے لی۔ عائشہ چپ رہی. وہ شوہر کو دوسری شادی سے روکنے کا حق نہیں رکھتی تھی۔

"منصور کو جب یہ خبر ملی کہ عائشہ نے تیسری بیٹی کو جنم دیا ہے تو وہ ہسپتال گیا ہی نہیں۔ بیٹی کو دیکھنا تک گوارہ نہ کیا۔ عائشہ جیسے تیسے گھر آئی، مگر منصورنے اسے اور بیٹیوں کو گھر میں آنے سے روک دیا۔ عائشہ نے اس کو بہت سمجھایا۔ اللّٰہ اور رسول کا واسطہ دیا تو بادل ناخواستہ منصور نے اس کو گھر میں رہنے کی اجازت دی۔ مگر اس سے زبردستی دوسری شادی کی اجازت لے لی۔ عائشہ چپ رہی. وہ شوہر کو دوسری شادی سے روکنے کا حق نہیں رکھتی تھی۔"

منصور نے دوسری شادی کر لی۔ نازیہ اور عائشہ ایک ہی گھر میں رہنے لگیں، مگر نازیہ کو عائشہ اور اس کی بیٹیاں بالکل بھی پسند نہیں تھیں۔ وہ ہر وقت اس کو نیچا دکھانے اور گھر سے نکالنے کی کوشش میں لگی رہتی۔ ایک دن عائشہ اپنی بیٹیوں کو اسکول سے لے کر گھر آئی تو نازیہ کو زمین پر پڑا ہوا دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ وہ منصور کو آواز دے ہی رہی تھی کہ وہ آ گیا اور نازیہ کو ایسی حالت میں دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ منصور کے پوچھنے پر نازیہ نے سارا الزام عائشہ پر ڈال دیا۔۔

منصور نے غصے میں آکر عائشہ کو گھر سے نکال دیا۔۔ عائشہ منصور کو سمجھاتی رہی، روتی رہی، مگر منصور نے اس کی ایک نہ سنی اور اسے اور تینوں بیٹیوں کو گھر سے نکال دیا۔

نازیہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر بہت خوش تھی۔ وہ ہر وقت طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر آرام کرتی رہتی۔ منصور خود ہی سارے کام کرتا۔

اللہ نے منصور کی دعا قبول کر لی اور اس کو بیٹے سے نوازا۔ وہ بہت خوش تھا، بیوی اور بیٹے کا بہت خیال رکھتا۔ منصور جب بھی اپنے بیٹے بلال کو دیکھتا اس کو لگتا اس کے اندر کوئی کمی ہے۔ ایک دن منصور نے اس کو بٹھانے کی کوشش کی مگر وہ بیٹھ نہ سکا اور لڑھک گیا، پہلے تو دونوں اس بات کو نہیں سمجھ سکے مگر ایک سال ہونے کے بعد اس کمی کو شدت سے محسوس کرنے لگے۔ اور بلال کو ڈاکٹر کے پاس لے گئے تو ڈاکٹر نے چیک اپ کرنے کے بعد بتایا کہ

"آپ کا بچہ پیدائشی ذہنی اور جسمانی طور پر کمزور ہے، اب یہ کبھی ٹھیک نہیں ہوگا۔"

منصور کو اس ڈاکٹر کی بات کا یقین نہ آیا، اس نے شہر کے کئی ڈاکٹرز سے بلال کا چیک اپ کروایا مگر سب کا یہی کہنا تھا کہ

"بلال ابنارمل بچہ ہے!"۔

منصور نے بلال کا علاج کروانے کے لیے اپنی ساری دکانیں بیچ ڈالیں۔ مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اللہ نے اس کے گھر سے برکت اور رحمت دونوں چھین لی مگر پھر بھی اس کی انا اور اکڑ میں کوئی کمی نہیں آئی۔۔

عائشہ نے اپنی بیٹیوں کی پرورش اور دیکھ بھال میں کوئی کمی نہیں رکھی۔ محلے والوں کے کپڑے سی کر اپنا گزارا کیا اور بیٹیوں کو تعلیم بھی دلوائی۔

تینوں بیٹیوں نے اعلی تعلیم حاصل کی۔ خدیجہ ڈاکٹر کی پوسٹ پر فائز ہوگئی، آفریں سرکاری ٹیچر اور سب سے چھوٹی بیٹی امرین کمپیوٹر انجینئر بن گئی۔

نازیہ، منصور کے معاشی حالات بگڑنے پر اسے چھوڑ کر چلی گئی۔

اب گھر میں صرف منصور اور اس کا اپاہج بیٹا بلال رہتا تھا۔ دکان کے ساتھ ساتھ گھر کے سارے کام خود اسی کو کرنے پڑ رہے تھے۔

منصور عائشہ کے حالات سے اچھی طرح واقف تھا۔

اب اس کو عائشہ کی ساری باتیں رہ رہ کے یاد آنے لگی تھیں۔ مگر اب "چڑیا چگ گئی کھیت" والا معاملہ تھا۔

ایک دن منصور کا اچانک ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ اسے اسی ہسپتال میں لایا گیا جہاں اس کی بیٹی خدیجہ ڈاکٹر تھی۔

خدیجہ نے جب اپنے باپ کو دیکھا تو اسے بہت غصہ آیا اور اس نے اس کا علاج کرنے سے انکار کرنا چاہا۔ پھر اس کو اپنی ماں کی نصیحت یاد آئی کہ

"کسی مجبور کو دیکھ کر منہ نہ پھیرنا، چاہے وہ تمھارا دشمن ہی کیوں نہ ہو۔"

خدیجہ کو احساس ہوا کہ بابا آج مجبور ہیں اور مجھے اپنے باپ کی مجبوری کا فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے۔ اس نے آپریشن کر دیا مگر منصور کا ایک پیر کاٹنا پڑا۔ اس کی جان بچانے کے لیے یہ ضروری تھا۔

دوسرے ڈاکٹر نے منصور کو آ کر جب بتایا اور ساتھ ہی اس کو "مبارک بادی" بھی دی کہ

"آپ کا آپریشن آپ کی بیٹی نے کیا ہے۔ آپ ایسی قابل بیٹی کے باپ ہیں" اور پھر وہ اس کی قابلیت اور اخلاق کی بھی تعریفیں کر کے اسے مبارک باد دیتے رہے۔

"منصور کو جب یہ خبر ملی تو بہت رویا۔ اس کو احساس بہت پہلے ہی ہوگیا تھا مگر اس کو قبول کرنے میں اس کی انا اور اکڑ آڑے آتی تھی، آج ساری انا اور اکڑ ختم ہوگئی تھی۔ اس نے عائشہ اور اپنی بیٹیوں سے معافی مانگی۔ اور عائشہ سے گھر واپس آنے کی التجا کرنے لگا۔ عائشہ نے اس کو معاف کر دیا اور بیٹیوں کے ساتھ اپنے گھر لوٹ آئی جہاں سے اسے بے عزت کر کے نکالا گیا تھا۔"

منصور کو جب یہ خبر ملی تو بہت رویا۔ اس کو احساس بہت پہلے ہی ہوگیا تھا مگر اس کو قبول کرنے میں اس کی انا اور اکڑ آڑے آتی تھی، آج ساری انا اور اکڑ ختم ہوگئی تھی۔ اس نے عائشہ اور اپنی بیٹیوں سے معافی مانگی۔ اور عائشہ سے گھر واپس آنے کی التجا کرنے لگا۔ عائشہ نے اس کو معاف کر دیا اور بیٹیوں کے ساتھ اپنے گھر لوٹ آئی جہاں سے اسے بے عزت کر کے نکالا گیا تھا۔

عائشہ منصور اور بلال کی بھی خدمت کرنے لگی۔ یہ سب دیکھ کر منصور کو سمجھ میں آ گیا کہ نیک بیوی اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہوتی ہے۔ اس نے اس نعمت کی قدر نہ کی تھی۔ بیٹا بیٹی سب اللہ کی دین ہے، اور ایک بیٹی بھی بیٹا بن سکتی ہے۔

اسے ہر وقت اپنے کیے پر پچھتاوا ہو رہا تھا۔ اور ہر وقت اللہ سے اور بیوی بچیوں سے معافی مانگتا رہتا تھا۔

عائشہ اور تینوں بیٹیاں اس کی خدمت کرتیں اور اب گھر میں بہاروں کا سماں تھا۔

□□□

Badar Fatima Qazi
C/o Mohammed Riyazuddin Quazi
H.No 4-419
Darga Road, Upper Galli
Sangtarashwadi
Gulbarga-585104 (Karnataka)

خوش قسمت

صاحبہ فردوس

میری کہانی جن کرداروں کے گرد پرواز کرتی تھی وہ کردار ہی میری کہانی سے اپنی کہانی کب کا ختم کر گئے تھے۔ میں زرتاشتہ ایک مکمل عورت تھی۔ مکمل عورت کہنا میرے خیال سے میری زندگی کو بالکل ٹھیک ڈیفائن کرتا تھا۔

وہ عورت مکمل ہی ہوتی ہے جس کے پاس عالیشان گھر ہو۔ شوہر کی محبت، اولاد جیسی نعمت اور دولت کا انبار ہو۔ یہ ساری چیزیں مل کر مجھے مکمل اور خوش قسمت بناتی تھیں۔ جب میرے حلقہ احباب کی خواتین مجھے دیکھ مدح سرا ہوتیں تو میری گردن اکڑ جاتی۔

میری خوش قسمتی مجھے دھیرے دھیرے مغرور بنا گئی تھی۔ میں اپنے سے چھوٹے لوگوں کی محفلوں میں جانے سے کترانے لگی تھی۔ یا یوں کہیں کہ اُنھیں حقیر جان کر نظر انداز کرنے لگی تھی۔ مگر جب میں اپنے عزیز واقارب کی چھوٹی موٹی تقریبوں میں شامل ہوتی تو خود کو اوروں میں نمایاں کرنے کی میری بھرپور کوشش ہوتی، پھر ہر طرف میرے اور میری فیملی کے چرچے ہوا کرتے تھے۔

میرا بڑا بیٹا فیصل جو ہمیشہ سے ذہین تھا۔ اُس نے ہائر اسٹڈیز کے لیے بیرون ملک جانے کی خواہش ظاہر کی تو میں خوش ہوگئی۔ میرے شوہر جو تھوڑے نہیں کافی متقی و پرہیز گار صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے انھیں اپنے وطن سے کافی لگاؤ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ہمارا بیٹا یہیں اپنے ملک میں رہ کر پڑھائی کرے۔ مگر میں نے اپنے بیٹے کی خواہش کو اپنی ضد بنالیا، پھر کیا تھا میرے شوہر کو ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔ اپنے بیٹے کو رُخصت کرتے ہوئے میرے شوہر کی آنکھیں نم تھیں مگر میں فخر سے مسکراتی ہوئی اُسے الوداع کر رہی تھی۔

☆............☆............☆

اپنے بڑے بیٹے کی طرف سے مطمئن ہوکر اب میری توجہ اپنے چھوٹے بیٹے فضل اور بیٹی انعم پر تھی۔ میں اُنھیں بھی بیرون ملک بھیجنے کے لیے تیار کر رہی تھی۔ ہر وقت میری توجہ دونوں کی پڑھائی کی طرف ہوتی، میری ڈانٹ پھٹکار اُنھیں شرارتیں کرنے سے روکتی تھی۔ میں نے اپنے دونوں بچوں کو بند کنویں میں قید کر دیا تھا جہاں وہ اپنی شوخیاں، شرارتیں دفن کر کے بڑے ہو رہے تھے۔ میری دیوانگی دیکھ میرے شوہر مجھے لتاڑتے ہوئے کہتے۔

"بس کردیں زرتاشہ بیگم! کہیں یہ بھی فیصل کی طرح ہمیں بھول نہ جائیں۔" میرے شوہر کو ہمیشہ اپنے بیٹے سے شکوہ رہتا کہ وہ باہر جا کر گوروں کے رنگ میں رنگ گیا ہے۔ اُسے ایک کال کرنے کی فرصت نہیں ہوتی۔ ماں باپ یاد نہیں رہے۔

میں اپنے شوہر کے ہر وقت کے شکوے پر بیزارگی سے گویا ہوئی۔

"آپ یہ کیوں نہیں سوچتے شہاب صاحب! ہم کتنے خوش قسمت ہیں کہ جن کی اولاد کو بیرون ملک پڑھنے کا سنہری موقع ملا ہے۔ لوگ ہم پر نازاں ہیں اور آپ ہیں کہ بلاوجہ چھوٹی سی بات کو دل پر لے لیتے ہیں۔"

"مجھے اس بات کا ڈر ہے زرتاشہ بیگم کہ ہمارے بچے ہم سے دور نہ ہو جائیں۔" میں اُن کے خدشات کو جھٹکتے ہوئے اُنھیں دوسری باتوں میں لگا دیتی تاکہ اُن کا دھیان بھٹک جائے۔ مگر اُن کے ابہام نے مجھے غلط ثابت کر دیا تھا۔

☆............☆............☆

وقت تھوڑا اور آگے سرکا تھا۔ میرا بیٹا فیصل جو سال میں ایک بار ہم سے ملنے چلا آتا تھا۔ اب نوکری لگنے کی وجہ سے اُسے اپنے ماں باپ کے پاس آنے کی فرصت نہیں رہی تھی۔

میرے شوہر بیٹے کو کافی یاد کرتے تھے تبھی اُسے واپس لانے کی خاطر مجھ سے ایک دن کہا۔

"اب تو فیصل کی جاب بھی لگ چکی ہے کیوں نہ ہم زرینہ آپا کی کسی بیٹی کے لیے بات کریں۔" میں اپنے شوہر کی سوچ پر تلملا سی گئی تھی۔ کہاں میرا بیٹا ڈالر زمیں کماتا تھا اور کہاں میری آپا کی بدتمیز، بدتہذیب بیٹیاں جنھیں نہ پہننے اوڑھنے کا ڈھنگ تھا نہ ہی بات کرنے کا سلیقہ۔

میں نے اپنے شوہر کی بات کو وہیں کاٹتے ہوئے کہا۔

"شہاب صاحب! آپ کس دور میں جی رہے ہیں۔ جانتے ہیں نا ہمارا بیٹا اتنے سالوں تک فارن رہا ہے اُس کے تو یہاں قدم ہی نہیں ٹھہرتے کجا کہ وہ یہاں کی کسی لڑکی کے لیے حامی بھرے گا۔"

"جانتا ہوں اُسے یہاں رہنا پسند نہیں ہے مگر جب آپ اُس سے بات کریں گی تو یقیناً وہ انکار نہیں کرے گا۔" پھر میں نے فیصل سے بات کرنے کا کہہ کر اُنھیں تسلی دی۔

میں تذبذب کا شکار تھی کہ کس طرح شوہر کو جواب دے کر مطمئن کروں۔ اُن ہی دنوں مجھے اپنے بیٹے کی کال آئی۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ وہ اپنی کولیگ کو پسند کرتا ہے اور اُس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ میں نے یہ بات اپنے شوہر کو گوش گزار دی۔ جس پر اُنھوں نے فوراً اپنے بیٹے کو کال کیا اور اعتراض کا پہلو اُٹھاتے ہوئے بولے۔

"کیا لڑکی فرنگی ہے؟" دوسری طرف سے سہمی ہوئی سی آواز اُبھری۔

"نہیں ڈیڈی وہ پاکستانی ہے۔" یہ سن کر میرے شوہر نے کچھ نہیں کہا اور میں تو ہواؤں میں اُڑ رہی تھی۔ خوشی اس بات کی تھی کہ مجھے کماؤ پوت بیٹے کے ساتھ ڈالرز کمانے والی بہو بھی مل گئی تھی مگر میرے شوہر تھوڑے سے ناراض رہا کرتے تھے۔ جیسے وہ میرے اور فیصل کے اس فیصلے سے خوش نہیں تھے۔

☆............☆............☆

شادی لندن میں ہی ہوئی تھی۔ ماڈرن دور میں جہاں ہر جگہ انسان کی پہنچ موبائل کے ذریعے ممکن ہو چکی ہے ویسے ہی میری فیملی نے شادی آن لائن اٹینڈ کی تھی۔ میرا خوبرو بیٹا اور بہو کو چاند سورج سے تشبیہ دینا غلط نہیں تھا۔

ابھی میرے بیٹے کی شادی کو تین ماہ ہی گزرے تھے کہ اچانک ایک دل دہلانے والی خبر آئی تھی۔ میری بہو سیمون کا ایکسیڈنٹ ہو چکا تھا اور وہ وہیں جاں بحق ہو چکی تھی۔ یہ سب کچھ کافی صدماتی تھا۔

ابھی اُس حادثے کو دو مہینے گزرے تھے کہ پھر میرے بیٹے کی کال آئی۔ وہ مجھ سے کہہ رہا تھا۔

"مما میں بہت پریشان ہوں۔ سیمون کے پیرنٹس ہر روز کسی نہ کسی آفیسر کو تفتیش کے لیے گھر بھیج دیتے ہیں وہ مجھے اپنی بیوی کا قاتل سمجھ رہے ہیں۔" میں اپنے بیٹے کی بات سن کر پریشان ہو چکی تھی تب میں نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"فیصل پریشان نہ ہو۔ میں اور ڈیڈی جلدی آپ کے پاس آنے کی کوشش کرتے ہیں۔" میں نے اپنے شوہر کو بیٹے کی حالت کے بارے میں بتایا۔ پھر جلدی اُنھوں نے لندن جانے کے لیے سیٹ بک کروائی۔ پرسوں صبح ہماری فلائٹ تھی۔

میں لان میں موجود سنگی بینچ پر بیٹھی تھی۔ میری نگاہیں زمین پر تھیں، لان کیچڑ سے اٹا پڑا تھا، مینڈک کے ٹرانے کی آوازیں جاری تھیں، وہ بھیانک سی آوازیں نکال کر پھدک رہے تھے۔ میں نے بیزارکن نگاہیں اُن پر ہٹا کر آسمان کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ مسلسل بارش کے بعد آسمان پر سورج بڑے دنوں بعد چمک رہا تھا۔ جس کے باعث ہر شے چمکدار نظر آ رہی تھی۔ پیڑ کیا پودے کیا ہر چیز پیلاہٹ میں ڈوبی ہوئی

تھی۔اچانک دور سے پرندوں کی ٹولی شور مچاتی ہوئی چلی آئی تھی۔اُن کا اچانک شور مچانا طوفان کا پیش خیمہ تھا۔

باہر کے شور سے گھبرا کر میں اندر چلی آئی تھی۔میرے گھر میں اکثر خاموشی رہا کرتی تھی مگر آج یہ خاموشی معمول سے زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔میں نے خود کو بہلانے کی کوشش کی مگر سب کچھ بے معنی تھا، میں بری طرح ناکام ہوئی تھی۔

اچانک میرا موبائل بجا اور سناٹے کو چیر گیا، کال میرے بیٹے کی تھی۔ابھی میں اُسے ہی یاد کر کے اُداس ہو رہی تھی، اُس کی کال دیکھ کر میرے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔میں نے موبائل کان سے لگایا تبھی دوسری طرف سے جو خبر مجھے ملی وہ میرا دل بند کرنے کے لیے کافی تھی۔موبائل میرے ہاتھ سے چھوٹا اور میں شہاب صاحب کے نام کی چیخ و پکار کرتے روم کی طرف دوڑی۔

میرا فخر، میرا غرور، میرا طنطنہ خاک میں مل گیا تھا، میں لٹ گئی تھی۔ذہنی دباؤ کے باعث میرے بیٹے نے خودکشی کرلی تھی۔میرا بیٹا جو ہنسی خوشی گیا تھا وہاں سے سالوں بعد تابوت میں بند لوٹا تھا اور میں اس بات پر فخر نہیں کرسکی تھی۔میں جو ہر وقت دلائل دے کر اپنے شوہر کو خاموش کروالیا کرتی تھی، آج سارے دلائل ساری تسلیاں مجھے ہی منہ چڑھا رہی تھیں۔وہ ایک خوبصورت بلا تھی جو میرے بیٹے کو جوانی میں کھا گئی تھی اور اپنے بیٹے کو میں نے ہی اُس بلا کے حوالے کیا تھا۔یہ قلق مجھے زندگی بھر رہے گا۔

میرا فخر، میرا غرور، میرا طنطنہ خاک میں مل گیا تھا، میں لٹ گئی تھی۔ذہنی دباؤ کے باعث میرے بیٹے نے خودکشی کرلی تھی۔میرا بیٹا جو ہنسی خوشی گیا تھا وہاں سے سالوں بعد تابوت میں بند لوٹا تھا اور میں اس بات پر فخر نہیں کرسکی تھی۔میں جو ہر وقت دلائل دے کر اپنے شوہر کو خاموش کروالیا کرتی تھی، آج سارے دلائل ساری تسلیاں مجھے ہی منہ چڑھا رہی تھیں۔وہ ایک خوبصورت بلا تھی جو میرے بیٹے کو جوانی میں کھا گئی تھی اور اپنے بیٹے کو میں نے ہی اُس بلا کے حوالے کیا تھا۔یہ قلق مجھے زندگی بھر رہے گا۔

قلق تو ایک اور بات کا تھا۔میں جو ہمیشہ سے اپنے دونوں بچوں کو مینرز سکھانے کے چکر میں تھی۔اب میرے بچے مینرز سیکھ چکے تھے، وہ ہر محفل میں خاموش ہوتے اور کونوں کھدروں میں دُبکے ہوتے۔اُن کی ہنسی، قہقہہ اور شرارتوں کا گلہ گھوٹنے والی بھی میں تھی۔

زندگی کب رُکتی ہے کہاں ٹھہرتی ہے۔وقت بھی انسانوں سے ضد باندھے کھڑا رہتا ہے کہ تُو وہیں رہ میں چلتا ہوں اور وہ گزر جاتا ہے۔وقت ہوا کے گھوڑوں پر سوار ہو گیا تھا اور ہم وہیں برف کا مجسمہ بنے رہے۔اپنے بیٹے کی جواں مرگ کا چبھتا ہوا احساس آج تک ہمارے سینوں پر رینگتا تھا۔اور وہ صدمہ تاحیات ہمارے اندر دفن رہنے والا تھا۔

ایک سال گزر گیا تھا۔ایک دن بڑی آپا کی کال آئی وہ مجھے اپنی بیٹی کی نسبت طے ہونے کا سنا رہی تھیں۔اور میں سُن ہوتے دماغ کے ساتھ وہ خبر سن رہی تھی پھر جلدی شادی کا کارڈ ملا۔ہماری زندگی میں جو جمود طاری ہوا تھا اُسے ہلکی سی ہوا چھو گئی۔

آج میں اپنی آپا کی بڑی بیٹی کی شادی میں آئی تھی۔میری آپا نے اپنی بیٹیوں کی پرورش بہت اچھے سے کی تھی۔وہ خوبصورت بااعتماد اور مکمل لڑکیاں تھیں۔اُنھیں دیکھ میرے اندر ایک حسرت رہ گئی تھی۔کاش میں اپنے شوہر کی بات مان لیتی۔۔۔میرے شوہر نے نم شکوہ کناں آنکھوں سے مجھے دیکھا اور میں نظریں چرا گئی۔

میرے اوپر جو 'خوش قسمت' ہونے کا ٹیگ لگا ہوا تھا وہ بڑی خوبصورتی سے 'میری بدنصیبی' میں بدل گیا تھا۔بدنصیبی میرے گھر کی باندی بن چکی تھی۔اب میرا گھر زندہ انسانوں سے بھرا قبرستان تھا اور اُس کی ذمے دار کہیں نہ کہیں میں تھی اور میری 'میں' ہی تھی۔

□□□

Saheba Firdous
D/o. Mohammad Ismail
Village:Anjangaon Surji
Shaniwara Peth,
Near Alam Chowk
Distt.Amravati-444705 (M.S)

محمد اکرم

ماحولیات و صحت

(Environment & Health)

ماحول کی حیاتیاتی اور غیر حیاتیاتی اجزا کے باہم فعل و انفعال کی بہت سی صورتیں ہیں لیکن طبیعی ماحول ہمیشہ جانداروں پر ایک اہم اثر ڈالتا ہے۔اس میں دن رات کا ہونا، بارش و خشکی، سردی و گرمی، اور ہواؤں کا چلنا انسانی صحت کو سیدھے طور پر متاثر کرتا ہے۔ بہت سی بیماریوں کا وبا کے طور پر پھیلنا انہی ماحولیاتی تغیرات کے سبب ہوتا ہے۔طبیعی ماحول بیماریوں کی شدت اور خفت میں بھی نمایاں کردار نبھاتا ہے اس کے لیے درج ذیل باتیں ذمہ دار ہوتی ہیں۔

1۔انسان کی قوت مدافعت کا کمزور ہونا

2۔بیماری پیدا کرنے والے مادّوں کی نشو ونما کے لیے موافق ماحول

3۔بیماریوں کے پھیلاؤ میں مختلف اشیا کا معاون ہونا

اس ضمن میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ آج کے دور میں خود انسان ہی بہت ساری بیماریوں کے فروغ کے لیے ذمہ دار ہے۔مثال کے طور پر سگریٹ میں موجود کیمیاوی اجزا سرطان کے لیے ذمہ دار ہوتے ہیں لیکن عادات کے ضمن میں خود انسان اس قسم کے سرطان کے لیے ذمہ دار ہوتا ہے۔

ماحول کے اقسام کے تحت تین طرح کا ماحول بیان کیا جاتا ہے۔ طبیعی جس میں ہوا، پانی، رہن سہن، غذا، فضلات اور کام کرنے کی جگہ وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔ دوسرے حیاتیاتی ماحول جس میں پیڑ پودے، جانور، حشرات، اور مختلف قسم کے جراثیم وائرس وغیرہ شامل کیے جاتے ہیں۔ تیسری قسم سماجی ماحول ہوتا ہے جس میں عادات، پیشہ، رسم و رواج، مذہب و ثقافت اور معاشی حالات شامل کیے جاتے ہیں۔

طبیعی ماحول ہماری صحت کے تحفظ اور بگاڑ دونوں میں اہم کردار نبھاتا ہے۔طبیعی ماحول کے اجزا اگر اعتدال کی حالت میں ہوتے ہیں تو یہ صحت کے لیے موافق ہیں اور ان میں کسی بھی قسم کا تغیر صحت کے بگاڑ کا سبب بن جاتا ہے۔

نظام شمسی میں سیاروں کے باہم گردش کرنے سے جو موسمی تغیرات پیدا ہوتے ہیں وہ انسانی صحت پر براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں اور ہر موسم باعتبار مزاج ہوا میں ایک خاص قسم کی نمایاں تبدیلی پیدا کر دیتا ہے۔ ستاروں کی گردش کے سبب ایک موسم دوسرے موسم سے ممتاز اور جدا ہوتا ہے اسی لیے ان معینہ اوقات کا نام فصول یا موسم رکھا گیا ہے۔طب یونانی

میں بنیادی طور پر چار موسموں کا ذکر کیا جاتا ہے جن کو ہم فصول اربعہ کے نام سے جانتے ہیں۔ فصول اربعہ میں جن موسموں کا شمار کیا جاتا ہے وہ ربیع، صیف، خریف اور شتا ہیں۔

زمین پر موسمی تغیرات تین امور پر منحصر ہیں یعنی زمین کا سورج کے گرد پورے ایک سال میں ایک بار چکّر لگانا، زمین کا اپنے محور پر 66.5^{o} پر ایک ہی سمت جھکا رہنا اور اپنے محور پر زمین کا گردش کرنا۔ ان اسباب کی وجہ سے موسم اور ان کی کیفیات ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں جن کے مطابق ہمیں اپنی طرز زندگی کو مناسب طریقہ سے تبدیل کرنا ضروری ہو جاتا ہے تبھی ہم اپنی صحت کو صحیح حالت میں قائم رکھ پاتے ہیں، ورنہ مختلف امراض میں مبتلا ہو جانے کا قوی امکان ہوتا ہے۔

فصل ربیع/موسم بہار (Spring season)

موسم ربیع یا بہار اپنی کیفیت کے لحاظ سے معتدل مزاج ہوتا ہے صحت کے لیے یہ موسم نہایت بہتر ہوتا ہے۔ اس موسم کا مزاج روح اور خون کے مزاج کے مناسب ہوتا ہے، اس کی گرمی اس حد تک نہیں پہنچتی کہ خون کو تحلیل کر دے جیسا کہ موسم گرما میں ہوتا ہے اس موسم میں خون اعتدال کے ساتھ جلد میں پہنچتا ہے جس سے یہ بدن میں سرخی اور نکھار پیدا کرتا ہے۔ موسم بہار میں امراض مزمنہ ہیجان میں آجاتے ہیں کیونکہ یہ موسم اپنی لطیف حرارت کی وجہ سے اخلاط یا مواد میں سیلان و حرکت دیتا ہے جس سے وہ اخلاط پگھل کر حرکت میں آجاتے ہیں جو موسم سرما میں جامد اور غیر متحرک پڑے تھے مگر یہ موسم ربیع میں موسم گرما کی طرح تحلیل نہیں ہو پاتے چنانچہ موسم ربیع تمام تر قوتوں کو قوی کر کے طبیعت کو فاسد مواد کے دفعیہ کے لیے آمادہ کرتا ہے اور جب یہ قوت پورے طور پر مواد کو دفع نہیں کر پاتی تو یہ مواد کو کمزور اور ڈھیلے اعضا مثلاً کنجران یا بغل و جلد کی طرف دفع کر دیا کرتی ہے اور اگر قوت بہت کمزور ہے اور ایسا نہیں کر پاتی تو یہ مواد دوران خون کے ساتھ سارے بدن میں پھیل جاتے ہیں اور اپنی کیفیت کے ساتھ مناسب امراض پیدا کرتے ہیں الغرض یہ موسم بالذات موجب امراض نہیں ہیں بلکہ دوسرے امور کی وجہ سے اس موسم میں مرض لاحق ہوتے ہیں یہ موسم مخالف امراض کو زائل کر دیتا ہے کیونکہ ہر مرض کا علاج بالضد کیفیت سے ہوا کرتا ہے اس موسم میں ان امراض میں تخفیف ہو جاتی ہے جو انجماد مواد سے پیدا ہوتے ہیں کیونکہ یہ مواد میں تحلل پیدا کرتا ہے۔

موسم ربیع کے مخصوص امراض نکسیر، اسہال دموی، نفث الدم، فالج، وجع المفاصل، مالیخولیا اورام حلق اور خراجات وغیرہ ہیں۔

فصل صیف/موسم گرما (Summer Season)

کیفیت کے لحاظ سے یہ موسم گرَم و خشک ہوتا ہے اس موسم میں سورج کی شعاعیں عمودی پڑتی ہیں اس سے حرارت بڑھ جاتی ہے جو ہوا کو گرم کر دیتی ہے اور لو چلنے لگتی ہے اس موسم میں دن کے بڑے ہونے سے گرمی بڑھ جاتی ہے اس موسم میں حرارت بڑھ جانے سے تحلل مواد و ارواح زیادہ ہوتا ہے جس سے قویٰ و افعال کمزور ہو جاتے ہیں خون اور بلغم

میں کمی واقع ہوتی ہے اور صفرا کی پیدائش بڑھ جاتی ہے موسم گرما صفرا کو جوش میں لاتا ہے جس سے صفراوی امراض پیدا ہوجاتے ہیں، مثلاً قے، متلی، غب، تپ محرقہ صفراویہ، پیاس کرب و بے چینی، آشوب چشم، بثور صفراویہ، خسرہ، چیچک، جلد پر یبوست وخشونت، زلق الامعا، استسقا وغیرہ۔ یہ موسم حرارت کی زیادتی کے باعث صفرا میں جوش پیدا کر دیتا ہے۔ انصباب صفرا سے معدہ میں حرارت کی زیادتی ہوتی ہے اس موسم کے آخر میں سودا کی زیادتی اور خون کی کمی ہوجاتی ہے اور تحلل مواد کے باعث مدت مرض بھی اس موسم میں کم ہوجاتا ہے۔ صفراوی مزاج والوں کے لیے یہ موسم انتہائی مضر ہے۔ ایسے لوگ حمیات حادہ یا مزمنہ کے شکار ہوجاتے ہیں۔ موسم کی شدت کے باعث صفرا کے احتراق سے سودا پیدا ہوکر امراض سوداویہ پیدا کرتا ہے۔

فصل خریف/موسم خزاں (Autumn Season)

موسم خزاں یا خریف موسم گرما کے باقی ماندہ امراض کا ذمہ دار ہے کیونکہ یہ اپنی برودت کی وجہ سے موسم گرما میں پیدا ہونے والے صفراوی مواد کو بدن میں روک دیتا ہے جس سے جسم کے اندر صفراوی خلط کا تناسب بڑھ جاتا ہے اور بدنی قوت بھی ان مواد کو پکانے اور تنقیہ کرنے سے عاجز ہوتی ہے جس سے ان مواد سے موسم گرما کے بقیہ امراض پیدا ہوتے ہیں اس موسم میں جرب، قوبا (حاد) قرحہ، وجع المفاصل، عسر البول، تقطیر البول، زلق الامعا عرق النسا، ورم لوزتین، دیدان شکم وغیرہ امراض خصوصاً ہوتے ہیں۔ اس موسم میں حرارت و برودت کی متضاد کیفیات کا یکے بعد دیگرے وارد ہونا بدن کو فاسد کر دیتا ہے۔

فصل شتا/موسم سرما (Winter Season)

یہ موسم باعتبار مزاج بارد رطب ہوتا ہے اور ہوا میں نمی ہوتی ہے جس سے وہ کثیف ہوجاتی ہے اور مواد بدنی کا تحلل کم ہوجاتا ہے اس موسم میں بلغم اور بلغمی امراض کثرت سے ہوتے ہیں جیسے نزلہ، زکام، کھانسی، امراض شش، ذات الجنب، ذات الریہ، اوجاع وغیرہ۔ اس موسم میں بیرونی برودت کے سبب جلدی مسامات تنگ ہوجاتے ہیں جس سے بارد مواد سے پیدا شدہ بارد اور غلیظ بخارات کا جلد کے باہر اخراج رک جاتا ہے اور وہ سر کی طرف صعود کر کے برودت کی وجہ سے رطوبت کی شکل میں تبدیل ہوکر سر میں جمع ہوجاتے ہیں اور برودت بڑھ جانے کے ہی سبب نچڑ کر ناک کی راہ پانی یا بلغم کی شکل میں خارج ہونے لگتے ہیں۔ موسم سرما میں کھانسی کی زیادتی کا سبب نزلاوی رطوبات کا انصباب سر سے سینہ کے اعضا کی طرف ہوتا ہے جن کی ترکیب میں بارد اعضا جیسے اعصاب و رباطات وغیرہ شامل ہیں اور بیرونی برودت ان کو ضعیف کر کے ان مواد کو قبول کرنے کے لیے آمادہ کر دیتی ہے جن کا انصباب ان پر بطور نزلہ ہوتا ہے۔

(ماخذ: محمد اکرم، ماحولیات وصحت، حفظان صحت، سن اشاعت 2018)

□□□

مراسلہ

ماہنامہ خواتین دنیا کا تازہ شمارہ ملا۔ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔شمارہ کافی معیاری لگا۔ مضامین نے بہت متاثر کیا۔ جانباز'خواتین کی خفیہ زبانیں'' اردو نظم نگاری کے بدلتے رنگ، معاصر خاتون افسانہ نگاروں کا فکر وفن، قابل تعریف مضامین ہیں۔ افسانہ کھڑکی بہت شاندار افسانہ ہے رسالہ کو ہر لحاظ سے بہتر پایا۔

آپ کے لیے ڈھیر ساری دعائیں اور دل کی گہرائیوں سے نیک خواہشات

نسرین نقاش، جموں وکشمیر

ماہنامہ خواتین دنیا کا تازہ شمارہ دستیاب ہوا۔ تمام مضامین پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ شبانہ عشرت کا مضمون 'سلطان اختر کی تحسینی رباعیاں' بہت پسند آیا۔ تنویر احمد علوی بحیثیت محقق ومدون بالکل یکساں مضمون ہے۔ پڑھ کر تازگی کا احساس ہوا۔ صدف پرویز نے مضمون میں اقبال سہیل کی مثنوی نگاری پر اچھی معلومات فراہم کی ہے۔ خواتین سے متعلق شازیہ اشرف کا مضمون بھی نیا اور معلوماتی ہے۔ محسن بھوپالی، 'حیرتوں کی سرزمین' پڑھ کر اچھا لگا۔ ناول کہانی کوئی سناؤ متاشا میں کسی نئے زاویے پر نگاہ نہیں ڈالی گئی ہے۔ مسائل نسواں کے تحت خواتین کی اعلیٰ تعلیم کے تعلق سے بہت عمدہ اور لاجواب مضمون ہے۔ شیبا کوثر کی نظم 'نئی صبح' نے بہت متاثر کیا تو وہیں رخشاں ہاشمی کی غزل کا پہلا شعر:

آنکھ سے رخشاں وہ اوجھل ہو گیا
ہم زیارت کر نہ پائے ٹھیک سے

بہت پسند آیا دوسری غزل کے یہ دو اشعار بھی بہت متاثر کن ہیں:

بہت تھوڑا مجھے جینا ہے شاید
محبت اس کی کم ہونے لگی ہے
وہ میرے ساتھ کیا چلنے لگے ہیں
خوشی ہر اک قدم ہونے لگی ہے

سلمیٰ صنم کا افسانہ 'دیوی' پڑھ کر اچھا لگا۔ 'وفا کی تلاش' بھی اچھی کوشش ہے۔ مذکورہ کہانی میں دو کردار آخر میں اپنی زندگی کی جنگ ہار جاتے ہیں، صحت سے متعلق مضمون بھی بہت عمدہ اور لاجواب ہے۔ صحت کا دارومدار صحت مند خون پر ہوتا ہے۔ اچھی اور عمدہ صحت کامیاب زندگی کی ضمانت دیتی ہے۔ جان ہے تو جہان ہے۔ ہم سب کو اپنی صحت کے تئیں ہمیشہ بیدار رہنا چاہیے اور کوشش کرنی چاہیے کہ ہم بیماریوں سے بچے رہیں۔ میگزین کے آخر میں قلمکاروں کی رائے دی گئی ہے۔

خواتین دنیا کے لیے نیک خواہشات اور اس میگزین کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں۔

صبا پروین، امراوتی، مہاراشٹر

□□□

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

انیس کے مرثیے (جلد اوّل ودوم)

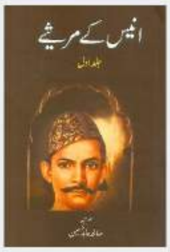

مرتبہ: صالحہ عابد حسین

تیسری اشاعت: 2022

صفحات: 504 (جلد 1)، 612 (جلد 2)

قیمت: 250 (جلد 1)، 275 (جل 2)

ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج

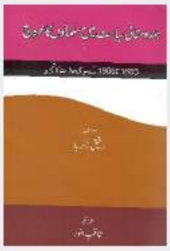

مصنف: رفیق زکریا، مترجم: ثاقب انور

دوسری اشاعت: 2022

صفحات: 533

قیمت: 245 روپے

آب وہوا کا سائنسی مطالعہ

مصنف: طاہر حسین، میری طاہر

مترجم: فرحت عثمانی

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 435، قیمت: 220 روپے

تاریخ طب یونانی (جلد اول)

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 448

قیمت: 220 روپے

نظری تنقید: مسائل ومباحث

مرتبہ: عفت آرا

دوسری اشاعت: 2022

صفحات: 233

قیمت: 125 روپے

تاریخ طب یونانی (جلد دوم)

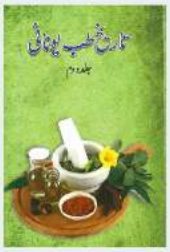

ادارہ

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 970

قیمت: 425 روپے

تشریح البدن (جلد سوم)

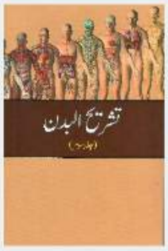

ادارہ

پہلی اشاعت: : 2022

صفحات: 455

قیمت: 210 روپے

تشریح البدن (جلد دوم)

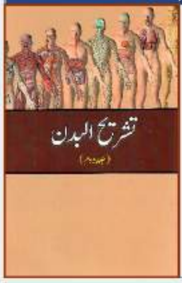

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 460

قیمت: 215 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

माहनामा ख्वातीन दुनिया मासिक, फरवरी -२०२३ वर्ष:७, अंक: २
Mahnama Khawateen Duniya Monthly February 2023, Vol.7 , Issue:2
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education , Department of Higher Education, Government of India

RNI. No. DELURD/2017/74026
DL (S)-17/3555/2021-23
ISSN 2581-4826
Date of Publication: 13-02-2023
Date of Dispatch : 14 and 15 of every month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

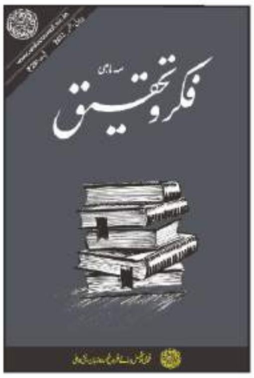

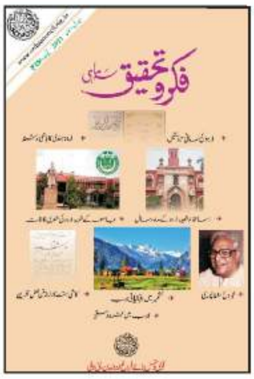

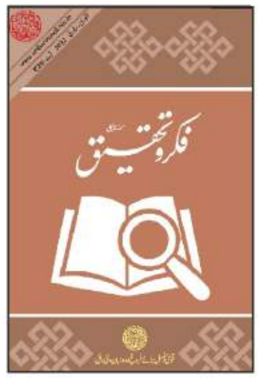

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad , Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPCDELHI,DELHIPSO,DELHIRMS,DELHI-6